نفسِ مطمئنّہ

آیت اللہ شہید دستغیبؒ

• ناشر •

ادارہ احیاءِ تراثِ اسلامی کراچی پاکستان
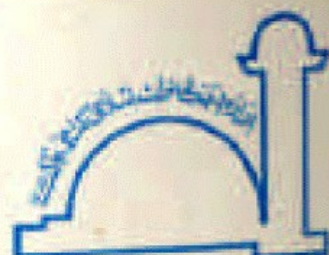
نفس مطمئنّہ

مصنف

شہید استاد سید محمد دستغیب

مترجم محمد بن علی باوہاب

ناشر

ادارہ احیائے تراث اسلامی ۔ کراچی ۔ پاکستان

نام کتاب	نفس مطمئنہ
مصنف	شہید محراب آیت اللہ دستغیب
مترجم	محمد بن علی باوباب
ناشر	ادارہ احیائے تراث اسلامی کراچی (پاکستان)
کیلی گرافی	جعفری گرافکس (فون ۶۸۴۹۲۴۳)
سن طباعت بار دوم	فروری ۱۹۹۵ء
تہیہ و تنظیم	احمد گروپ آف سروسز (پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری ڈویژن)
تعداد	ایک ہزار (۱۰۰۰)
قیمت	______

ملنے کا پتہ

احمد بک سیلرز اینڈ اسٹیشنرز

۲۰/۱۸، فیڈرل بی ایریا کراچی (پاکستان)

فون نمبر ۶۳۶۳۹۲۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

فہرست مضامین

باب اول

صفحہ نمبر

صفحہ نمبر

باب دوم

باب چہارم

صفحہ نمبر

باب پنجم | صفحہ نمبر

باب ششم

صفحہ نمبر

باب ہفتم صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

اس کتاب کے حوالے سے جو کچھ میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسے بہت پہلے یعنی اوائل ۱۹۹۱ میں زیور طبع سے آراستہ ہو جانا تھا۔ کتاب ہذا کا ترجمہ میرے مہربان اور مخلص جناب محمد بن علی باوہاب نے معمولی سی تاخیر کے ساتھ مکمل کر لیا تھا کچھ میری ہی تقصیر ہے جو آیت اللہ دستغیب جیسے جلیل القدر عالم کی منفرد اور نایاب تصنیف اس قدر تاخیر سے پیش کر رہا ہوں۔

کتاب میں عربی (آیات قرآنی) کا بے حد استعمال ہے اور یہی میری راہ میں مانع تھا راستے کی اس مشکل میں میرا ساتھ میرے عزیز و بزرگوار جناب مولانا سید عطا محمد عابدی صاحب نے دیا اور نہ صرف یہ کہ بار بار تصحیح کی زحمات برداشت کیں بلکہ اہمیت مضمون کے پیش نظر مکمل نظر ثانی بھی کی۔

اپنی کوتاہی کا ازالہ اس طرح کر رہا ہوں کہ اس کتاب کی طباعت کے ساتھ شہید استاد مطہری کی معرکتہ الارا تصنیف "حق وباطل" ڈاکٹر محمود حکیمی کی منفرد تصنیف "قصص الحیوان فی القرآن" بچوں کے لئے "مہتاب کا سفر" اور ردّ وہابیت (جو دراصل ہر مسلمان خواہ وہ سنی ہو یا شیعہ کا فریضہ ہے) کے موضوع پر ایک کتاب "وہابیت علمائے اہل سنت کی نظر میں" بھی پیش کی جارہی ہے

اجازت چاہوں گا اور آپ کی آراء کا منتظر رہوں گا۔

شہنشاہ جعفری ایڈوکیٹ
ناظم ادارہ احیائے تراث اسلامی
کراچی پاکستان

۱۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

روح ایک لطیفۂ غیبی ہے جو عالم امر سے عالم مادی میں ظہور پذیر ہوا ہے

خداوند قدوس خالق کون و مکان روح کو جو ہنوز عالم خلق سے بیگانہ و ناآشنا تھی اس عالم مادی میں لے آیا اور جب تک وہ تجریدی حالت میں تھی تو خود خدائے ذوالجلال کے حفظ و امان میں رہی اور مشیت الہٰی نے جب چاہا اس کو ظاہر فرمادیا۔ گویا روح کا تعلق اللہ جل شانہ کے عالم امری سے ہے۔

وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي

(سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۵)

جس کی حقیقت کا علم ہم خاکیوں کی دسترس سے باہر ہے جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے کہ اسکے بارے میں ہمیں بہت تھوڑا علم عطا ہوا ہے۔

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا○

(سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۵)

یعنی جس حد تک اس کے آثار و لوازم ہمارے نفس ناطقہ پر حاوی ہیں اور جو ہمارے بدن و مادہ کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

روح کا تعلق جب مادہ کے ساتھ ہو جائے تو نفس بن جاتا ہے

جب روح اپنی مجرد حالت سے نکل کر ہمارے بدن کے ساتھ تعلق پیدا کر کے اس عالم طبیعی و مادی کے قفس میں مقید ہو جائے تو اصطلاحاً اس حالت کو "نفس" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ روح کو انسانی بدن کے ساتھ تعلق سے پہلے عالم ارواح میں نہ تو خواہشات و شہوات اور نہ مادی احتیاجات سے سروکار ہوتا ہے اور نہ حکومت و شہرت یا مال و دولت کی طمع ہوتی ہے لیکن جوں ہی بدن کے ساتھ اس کا ائتلاف عمل میں آتا ہے، اس میں خود فراموشی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح اقتضائے طبیعت سے مجبور ہو کر عالم مادی کی آلودگیوں سے مبرا و پاک صاف نہیں رہ سکتی اور وہ جو اس وقت تک مادی احتیاجات میں ملوث نہیں تھی، طبعی جسم کے ساتھ تعلق پیدا ہوتے ہی اس میں خواہشات و احتیاجات جنم لینے لگتی ہیں۔

نفس انسانی خدا کا کھلا دشمن بن جاتا ہے

انسان کی تخلیق کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ اس میں بتدریج ادراکات کی صلاحیت پیدا ہونے لگی ہے جس کی ابتداء سمعی، بصری اور لمسی حسیات سے

ہوتی ہے جو معلومات کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں پھراس کے نتیجہ میں خواہشات نفسانی و شہوانی کا ظہور ہونے لگتا ہے ۔ وہ چونکہ حقیقت کے علم سے بیگانہ و ناآشنا ہوتا ہے اس لئے اپنے جہل کے نتیجہ میں مبدء اصلی سے دور ہونے لگتا ہے اور غیر خدا کی طرف اپنی توجہ کو مرکوز کر دیتا ہے ۔ گویا روح مجرد جو ہر طرح کی مادی آلودگی سے پاک ہوتی ہے ، انسان کے بالغ العمر ہوتے اور ہوش سنبھالتے ہی اس دنیا کی رنگینیوں میں مبتلا ہو کر اپنے خالق کا کھلا دشمن بن جاتا ہے ۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝

(سورہ النحل آیت ۴)

یعنی جس کی تخلیق تو منی کی ایک حقیر بوند سے ہوتی ہے لیکن اب وہ " خصیم مبین " بن کر خدا کی محبت اور اس کی رضا کا طالب ہونے کے بجائے جب دنیا اور جاہ طلبی میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ نتیجہ یہ کہ وہ قانون خداوندی یعنی شریعت سے روگردانی اور اس کی مقررہ حدود سے تجاوز کا مرتکب ہونے لگتا ہے ۔

نفس کی تجریدی حالت ہر حال میں برقرار رہتی ہے ۔

یہ عجیب بات ہے کہ روح مادی دنیا اور بدن کے ساتھ تعلق قائم کر لینے کے بعد بھی اپنی تجریدی حالت برقرار رکھتی ہے ۔ یوں تو اس کے ثبوت میں بے شمار دلائل موجود ہیں لیکن سب سے روشن دلیل تو اسکی وہ صفات ہیں کہ مجرد حالت کے بغیر ان میں سے ایک کی بھی وہ حامل نہیں ہو سکتی ۔ اب علم ہی کو لیجئے ۔ اس میں تو کوئی شبہ کی گنجائش نہیں کہ علم ایک ایسی صفت ہے جو مادی نہیں ۔ وہ ابعاد ثلاثہ یعنی طول ، عرض اور حجم کا پابند نہیں ۔ سوال یہ ہے

ہوتی ہے جو معلومات کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں پھر اس کے نتیجہ میں خواہشات نفسانی و شہوانی کا ظہور ہونے لگتا ہے ۔ وہ چونکہ حقیقت کے علم سے بیگانہ و ناآشنا ہوتا ہے اس لئے اپنے جہل کے نتیجہ میں مبدء اصلی سے دور ہونے لگتا ہے اور غیر خدا کی طرف اپنی توجہ کو مرکوز کر دیتا ہے ۔ گویا روح مجرد جو ہر طرح کی مادی آلودگی سے پاک ہوتی ہے ، انسان کے بالغ العمر ہوتے اور ہوش سنبھالتے ہی اس دنیا کی رنگینیوں میں مبتلا ہو کر اپنے خالق کا کھلا دشمن بن جاتا ہے ۔

خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ

(سورہ النحل آیت ۴)

یعنی جس کی تخلیق تو منی کی ایک حقیر بوند سے ہوتی ہے لیکن اب وہ "خصیم مبین" بن کر خدا کی محبت اور اس کی رضا کا طالب ہونے کے بجائے جب دنیا اور جاہ طلبی میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ نتیجہ یہ کہ وہ قانون خداوندی یعنی شریعت سے روگردانی اور اس کی مقررہ حدود سے تجاوز کا مرتکب ہونے لگتا ہے ۔

نفس کی تجریدی حالت ہر حال میں برقرار رہتی ہے ۔

یہ عجیب بات ہے کہ روح مادی دنیا اور بدن کے ساتھ تعلق قائم کر لینے کے بعد بھی اپنی تجریدی حالت برقرار رکھتی ہے ۔ یوں تو اس کے ثبوت میں بے شمار دلائل موجود ہیں لیکن سب سے روشن دلیل تو اسکی وہ صفات ہیں کہ مجرد حالت کے بغیر ان میں سے ایک کی بھی وہ حامل نہیں ہو سکتی ۔ اب علم ہی کو لیجئے ، اس میں تو کوئی شبہ کی گنجائش نہیں کہ علم ایک ایسی صفت ہے جو مادی نہیں ۔ وہ ابعاد ثلاثہ یعنی طول ، عرض اور حجم کا پابند نہیں ۔ سوال یہ ہے

ہوتی ہے جو معلومات کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں پھر اس کے نتیجہ میں خواہشات نفسانی و شہوانی کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ وہ چونکہ حقیقت کے علم سے بیگانہ و ناآشنا ہوتا ہے اس لئے اپنے جہل کے نتیجہ میں مبدء اصلی سے دور ہونے لگتا ہے اور غیر خدا کی طرف اپنی توجہ کو مرکوز کردیتا ہے۔ گویا روح مجرد جو ہر طرح کی مادی آلودگی سے پاک ہوتی ہے، انسان کے بالغ العمر ہوتے اور ہوش سنبھالتے ہی اس دنیا کی رنگینیوں میں مبتلا ہو کر اپنے خالق کا کھلا دشمن بن جاتا ہے۔

خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ

(سورہ النحل آیت ۴)

یعنی جس کی تخلیق تو منی کی ایک حقیر بوند سے ہوتی ہے لیکن اب وہ "خصیم مبین" بن کر خدا کی محبت اور اس کی رضا کا طالب ہونے کے بجائے جب دنیا اور جاہ طلبی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ قانون خداوندی یعنی شریعت سے روگردانی اور اس کی مقررہ حدود سے تجاوز کا مرتکب ہونے لگتا ہے۔

نفس کی تجریدی حالت ہر حال میں برقرار رہتی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ روح مادی دنیا اور بدن کے ساتھ تعلق قائم کر لینے کے بعد بھی اپنی تجریدی حالت برقرار رکھتی ہے۔ یوں تو اس کے ثبوت میں بے شمار دلائل موجود ہیں لیکن سب سے روشن دلیل تو اسکی وہ صفات ہیں کہ مجرد حالت کے بغیر ان میں سے ایک کی بھی وہ حامل نہیں ہو سکتی۔ اب علم ہی کو لیجئے، اس میں تو کوئی شبہ کی گنجائش نہیں کہ علم ایک ایسی صفت ہے جو مادی نہیں۔ وہ ابعاد ثلاثہ یعنی طول، عرض اور حجم کا پابند نہیں۔ سوال یہ ہے

کہ ایک چیز جو مجرد ہو وہ کسی مادی شے میں گھر کر سکتی ہے؛ لہذا بدیہی طور پر علم کا محل انسان کا نفس ناطقہ ہی ہے نہ کہ اس کا بدن۔ گویا نفس بہر حال مجرد حالت ہی میں موجود رہتا ہے تب ہی وہ دوسری مجرد شے یعنی علم کو جگہ دیتا ہے کیونکہ مجرد شے کسی مادی مکان کو قبول نہیں کر سکتی۔

مجرد شے کا مادہ سے تعلق پیدا کرنا، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا مظہر ہے۔ اور انسان کی تخلیق حق تعالیٰ سبحانہ کی اسی قدرت کا اظہار ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں کائنات کی آفرینش کے مدارج اور انسان کے وجود میں بدن وروح کے تعلق بیان کرنے کے بعد انسان کی تخلیق کو خدائے عزوجل نے اپنا شاہکار گردانا ہے اور اپنے آپ کو احسن الخالقین کے نام سے موسوم کیا ہے

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۔

(سورہ المومنون آیت ۱۴)

پس خداوند قدوس نے روح مجرد کا عالم مادی سے ائتلاف اور دو متضاد چیزوں کو یکجا کر کے اس عجوبہ روزگار شے کی تخلیق فرمائی ہے جو انسان کہلاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ قدرت خداوندی کا یہ شاہکار ہے۔ پھر اسی مناسبت سے حصول علم کے لئے اللہ رب العزت نے انسان کو ایسا بدن عطا فرمایا ہے کہ وہ اپنے حواس سے کام لے سکے۔ چنانچہ پہلے پہل جب وہ بطن مادر سے تولد ہوتا ہے تو اسے کسی چیز کا علم نہیں ہوتا۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا

(سورہ النحل آیت ۷۸)

اس کے بعد وہ آنکھ، کان اور عقل وفہم کو جو عطیہ خداوندی ہیں، اپنے علم کا ذریعہ بناتا ہے۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ○

(سورہ النحل آیت ۷۸)

کیا یہ حیرت کا مقام نہیں کہ اللہ تعالیٰ علم کو جو خود بھی مجرد ہے، مجرد مقام پر پہنچانے کے لئے مادی اسباب مہیا فرماتا ہے ۔ جب ان حواس کے ذریعہ انسان کی معلومات میں اضافہ ہوجاتا ہے تو وہ دیگر علوم کی تحصیل پر بھی قادر ہوجاتا ہے جن میں وہ علوم بھی شامل ہیں جنہیں "معقولات ثانویہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور مادہ یا مادی اشیاء سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

الہام بھی نفس کے تجرد کی ایک اور نشانی ہے

نفس کے مجرد ہونے کی نشانیوں میں سے ایک الہام خداوندی بھی ہے جس کے ذریعہ مستقبل کی بعض باتوں اور دور دراز کے پیش آنے والے واقعات وحالات کا علم ہوجاتا ہے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ بہت سے انسانوں کو بذریعہ الہام ایسی باتوں کی جانب متوجہ فرمادیتا ہے جن میں خیر یا شر کا پہلو ہو جیسا کہ سورہ شمس میں ارشاد ہوا ہے ۔

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا - فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا○

(سورہ الشمس آیات ۷،۸)

اس آیہ مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سارے ہی انسانوں کو خیر وشر اور فجور وتقویٰ کے بارے میں بذریعہ الہام علم عطا فرمایا ہے ۔ البتہ اصطلاح خاص میں "نفس ملہمہ" کا اطلاق بالخصوص ان نفوس پر ہوتا ہے جو مکمل پاکبازی اور پرہیزگاری پر عمل پیرا ہو کر مادی آلائشوں اور دنیاوی آلودگیوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھتے ہیں۔

نفس امارہ و نفس لوامہ ایک ہی نفس کی دو حالتیں ہیں

نفس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مختلف حالات میں مختلف حالتوں میں ہوتا ہے۔ اولاً تو ہر نفس، نفس امارہ اور بدی کی جانب راغب رہتا ہے بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور توفیق الٰہی اس کو بچالے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ

(سورہ یوسف آیت ۵۳)

جب نفس امارگی کی حالت سے لوامگی کی حالت کو پہنچتا ہے تو وہ برائیوں پر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتا ہے نیز بد کرداری پر نادم و شرمندہ ہوتا ہے۔ ایسے وقت الطاف و اکرام الٰہی کی تجلی اسے جہل مرکب کے اندھیرے سے نکال لیتی ہے۔ گویا نفس امارہ زندگی کے تمام تر منفی پہلو سے اور نفس لوامہ تمام تر مثبت پہلو سے عبارت ہے اور جب وہ امارگی کی حالت سے لوامگی کی جانب گامزن ہونے لگتا ہے تو یہ ایسی کیفیت ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بھی اسکی قسم کھائی ہے۔

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝

(سورہ القیامہ آیت ۲)

نفس امارہ اور نفس لوامہ کا باہمی تعلق

یہاں ایک نکتہ قابل توجہ ہے کہ نفس کی دونوں حالتوں یعنی امارگی و لوامگی کے مابین متاز ... سا تعلق پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کسی کے بارے میں سوء ظن رکھتا ہے کہ جس کو قرآن مجید میں گناہ کبیرہ کہا گیا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ۝

(سورہ الحجرات آیت ۱۲)

ممکن ہے کہ اسی سوء ظن کی بنا پر وہ اس شخص کی غیبت کرنا چاہے لیکن یکایک اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ خود کو اس گناہ کی پاداش میں ملامت کرنے لگتا ہے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس شخص کی غیبت کرنے لگے لیکن بروقت اسے اپنی بدگمانی کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ اس گناہ کے ارتکاب پر خود کو لعن طعن کرنے لگتا ہے تو وہ سوء ظن کے تعلق سے امارگی کی حالت سے لوامگی کی حالت میں پہنچ جاتا ہے تاہم غیبت کے معاملہ میں اس کے رویہ سے ابھی بھی امارگی کا اظہار ہوتا ہے گویا اکثر نفوس کبھی تو امارگی کی حالت میں ہوتے ہیں اور کبھی لوامگی کی۔

امارگی کا اصل سبب غفلت اور لوامگی کا لازمہ یاد الہٰی اور ذکر الہٰی ہے۔ کیونکہ جب تک کوئی شخص غفلت سے پیچھا نہ چھڑا لے وہ نہ تو امارگی سے نجات حاصل کر سکتا ہے اور نہ نفس مطمئنہ تک اسکی رسائی ہو سکتی ہے۔

یاد خدا اور اطمینان نفس

یاد خدا و ذکر الہٰی اطمینان قلب کا سرچشمہ ہے اور ایک وقت وہ آتا ہے کہ یہ اطمینان حد کمال کو پہنچ جاتا ہے اور نفس انسان نفس مطمئنہ بن جاتا ہے۔ گویا نفس مطمئنہ کے لئے ہمہ تن یاد الہٰی دوسری تمام باتوں پر مقدم ہے۔ نیز حزن و ملال جو غفلت کے آفریدہ ہوتے ہیں، ان کا مداوا بھی یاد خدا ہے اور ذکر الہٰی کی برکت سے مکمل طمانیت قلب حاصل ہوتی ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ○

(سورہ رعد آیت ۲۸)

اور جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو امارگی بلکہ لوامگی سے بھی نجات مل جاتی ہے اور غفلت کو جوان کا اصل سر چشمہ و منبع ہے، یاد الہیٰ بیخ و بن سے اکھیڑ پھینکتی ہے۔

صفات الہیٰ اور مشیت الہیٰ پر یقین کامل ہی اصل ایمان اور توحید ہے

کافی غور و خوض کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دراصل اطمینِ قلب "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" پر کامل یقین رکھنے ہی سے حاصل ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی قوت اور حفظ و امان کے سوا کسی دوسری طاقت کا وجود حقیقتاً ہے ہی نہیں اور کائنات میں کوئی چیز خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، اس کے حکم یا مشیت و علم کے بغیر نہ اپنا وجود رکھتی ہے اور نہ واقع ہو سکتی ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○

(سورہ الانعام آیت ۵۹)

پس ذکر الہیٰ کی مداومت تمام مصائب و آلام سے نجات کا ذریعہ بھی ہے کیونکہ انسان کو مادی خوشحالی یا دنیوی زندگی کی نیرنگیاں اور دلفریبیاں دھوکا نہیں دے سکتیں۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ○ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ○

(سورہ الحدید آیات ۲۲، ۲۳)

رضاء الہیٰ کا طلبگار ہونا اور مرضی خداوندی کے آگے سر تسلیم خم کر دینا اطمینان قلب کا باعث ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خدا کی خوشنودی کا طالب ہونے اور اپنی مرضی کو رضاء الہیٰ کا تابع بنا دینے کے بعد نفس انسانی اس قدر مطمئن ہو جاتا ہے کہ کسی اور چیز میں اس کے لئے کوئی خوبی نہیں پائی جاتی اور ہر بلت میں اس کو خیر ہی خیر دکھائی دیتا ہے یہاں تک کہ شدید ترین مصائب میں بھی اس کو ہر چیز میں اثباتی پہلو دکھائی دیتا ہے نہ کہ منفی پہلو۔ اور وہ ان پر بآسانی غالب آجاتا ہے۔ کسی فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "میرے محبوب بوسہ بھی دو اور گالی بھی دو تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہ دونوں میں شیریں ترین کون سا ہے" گویا دوست جو پسند کرے وہی خوشنودی کا باعث ہے کیونکہ دوست تو اس کے لئے خیر کے سوا کسی اور چیز کو پسند ہی نہیں کرتا۔ اب یہ امر بدیہی ہے کہ اگر نفس راضی بہ رضا ہو جائے تو خدا بھی اس سے راضی ہو جاتا ہے اور اس کا شمار "حزب اللہ" میں ہوتا ہے۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ۝ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ ۝

(سورہ المجادلہ آیت ۲۲)

الحاج سید محمد ہاشم دستغیب

۲۴ صفر المظفر ۱۴۰۳ھ

باب اوّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نفس مطمئنہ کے کامل مصداق حضرت امام حسینؑ ہیں۔

سورہ والفجر کی آخری آیت شریفہ

" یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ "

کے بارے میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ امام حسینؑ پر پوری طرح اطلاق ہوتا ہے اور بدرجہ اتم اس کی مصداق وہی کامل ہستی ہے لہذا سورہ والفجر دوسرے معنوں میں وہ سورہ حسینؑ ہی ہے۔

ایک اور روایت ہے کہ جو شخص اپنے فرض، سنت اور نفل نمازوں میں پابندی سے اس سورہ کی تلاوت کرے گا وہ قیامت کے دن امام حسینؑ کے ساتھ محشور ہو گا۔

اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کی شرح و تفسیر کر کے

یہ معلوم کیا جائے کہ کس طرح اس کا انطباق امام حسین کی ذات پر ہوتا ہے نیز اس تفسیر کی روشنی میں ہر شخص اپنے حسب حال یہ دیکھ سکے گا کہ اس کی اپنی ذات پر کس حد تک اطلاق ہو رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس آیت شریفہ کی تفسیر کے ضمن میں جو واقعات و حقائق بیان کئے جائیں گے وہ بخوبی ذہن نشین ہونگے۔

بشریت کے کمال کا آخری درجہ

نفس مطمئنہ دراصل انسان کی سیرت کے کمال کا آخری درجہ ہے۔ نفس کی پہلی حالت "امارگی" ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ"

پس جب وہ کمال کی طرف رجوع ہوتا ہے اور اس کے لئے کوشاں ہوتا ہے تو نفس لوامہ بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"فَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ"

پھر الہام کا مرحلہ آتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔

"فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا"

یہ کیفیت نفس ملھمہ کی ہوتی ہے اس حالت سے آگے بڑھ کر اطمینان نفس کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بھی مراتب ہیں جس کی انتہا راضیہ مرضیہ یعنی اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔ گویا آخری درجہ کمال وہ ہے جس میں علم و عمل نفس کے لئے بال و پر بن جاتے ہیں اور وہ ملاء اعلیٰ کی طرف پرواز کرنے لگتا ہے۔ یہاں نفس کے درجہ کمال کے انہی چار مراتب کا خلاصہ بیان کرنا مقصود ہے۔

نفس تو ایک ہی ہے لیکن وہ مختلف الحال ہوتا ہے۔

ضمناً اس کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نفس کی یہ چاروں کیفیات یعنی امارہ، لوامہ، ملہمہ اور مطمئنہ چار علیحدہ علیحدہ وجود کے حامل نہیں بلکہ نفس واحد ہی کی چار مختلف حالتیں ہیں اور باعتبار حالات نفس بھی مختلف الحال ہوتا رہتا ہے۔ ہر فرد بشر اپنی سیرت و کردار کے بموجب انہی چاروں مراتب میں سے کسی ایک مرتبہ کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی ہر نفس ایک وقت میں کسی ایک حالت میں ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ابتداء میں نفس امارہ ہوتا کیا ہے؟ اس کا جواب ہے نفس انسانی۔ شروع میں جب وہ عقل و فہم کی روشنی سے ناآشنا ہو تو امارگی کی حالت میں ہوتا ہے اور اپنی انتہائی حالت میں اس پر سرکشی نیز حاکمیت کی دھن سوار ہوتی ہے اور وہ خود کو بندہ حقیر و عاجز خیال کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور داعیان الی اللہ کی تعلیمات اس تک پہنچتی رہتی ہیں کہ اللہ قادر مطلق ہے اور حکیم و خبیر ہے جو اپنے بندوں پر زبردست قدرت رکھتا ہے۔ "وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ"
(سورہ انعام - آیت ۱۸)

لیکن اپنے زعم باطل میں وہ اپنے آپ کو حقیقی فرمانروا اور حاکم خیال کر بیٹھتا ہے۔ وہ ہرگز اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا کہ خود کو زیردست یا بندہ خیال کرے اور اسی خام خیالی میں بندہ کی حیثیت سے اپنے فرائض اور واجبات کی بجاآوری میں ہزاروں حیلوں بہانوں سے کام لیکر پہلو تہی کرنے لگتا ہے۔

یہ معلوم کیا جائے کہ کس طرح اس کا انطباق امام حسینؑ کی ذات پر ہوتا ہے نیز اس تفسیر کی روشنی میں ہر شخص اپنے حسب حال یہ دیکھ سکے گا کہ اس کی اپنی ذات پر کس حد تک اطلاق ہو رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس آیت شریفہ کی تفسیر کے ضمن میں جو واقعات و حقائق بیان کئے جائیں گے وہ بخوبی ذہن نشین ہونگے۔

بشریت کے کمال کا آخری درجہ

نفس مطمئنہ دراصل انسان کی سیرت کے کمال کا آخری درجہ ہے۔ نفس کی پہلی حالت "امارگی" ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ"

پس جب وہ کمال کی طرف رجوع ہوتا ہے اور اس کے لئے کوشاں ہوتا ہے تو نفس لوامہ بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"فَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ"

پھر الہام کا مرحلہ آتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا"

یہ کیفیت نفس ملہمہ کی ہوتی ہے اس حالت سے آگے بڑھ کر اطمینان نفس کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بھی مراتب ہیں جس کی انتہا راضیہ مرضیہ یعنی اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔ گویا آخری درجہ کمال وہ ہے جس میں علم و عمل نفس کے لئے بال و پر بن جاتے ہیں اور وہ ملاء اعلیٰ کی طرف پرواز کرنے لگتا ہے۔ یہاں نفس کے درجہ کمال کے انہی چار مراتب کا خلاصہ بیان کرنا مقصود ہے۔

نفس تو ایک ہی ہے لیکن وہ مختلف الحال ہوتا ہے۔

ضمناً اس کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نفس کی یہ چاروں کیفیات یعنی امارہ، لوامہ، ملہمہ اور مطمئنہ چار علیحدہ علیحدہ وجود کے حامل نہیں بلکہ نفس واحد ہی کی چار مختلف حالتیں ہیں اور باعتبار حالات نفس بھی مختلف الحال ہوتا رہتا ہے۔ ہر فرد بشر اپنی سیرت و کردار کے بموجب انہی چاروں مراتب میں سے کسی ایک مرتبہ کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی ہر نفس ایک وقت میں کسی ایک حالت میں ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ابتداء میں نفس امارہ ہوتا کیا ہے؟ اس کا جواب ہے نفس انسانی۔ شروع میں جب وہ عقل و فہم کی روشنی سے ناآشنا ہو تو امارگی کی حالت میں ہوتا ہے اور اپنی انتہائی حالت میں اس پر سرکشی نیز حاکمیت کی دھن سوار ہوتی ہے اور وہ خود کو بندہ حقیر و عاجز خیال کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور داعیان الی اللہ کی تعلیمات اس تک پہنچتی رہتی ہیں کہ اللہ قادر مطلق ہے اور حکیم و خبیر ہے جو اپنے بندوں پر زبردست قدرت رکھتا ہے۔ "وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ"

(سورہ انعام۔ آیت ۱۸)

لیکن اپنے زعم باطل میں وہ اپنے آپ کو حقیقی فرمانروا اور حاکم خیال کر بیٹھتا ہے۔ وہ ہرگز اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا کہ خود کو زیردست یا بندہ خیال کرے اور اسی خام خیالی میں بندہ کی حیثیت سے اپنے فرائض اور واجبات کی بجاآوری میں ہزاروں حیلوں بہانوں سے کام لیکر پہلو تہی کرنے لگتا ہے۔

بندگی کے منصب سے جی چرانا

اے انسان تو فراموش کر بیٹھتا ہے کہ نطفہ کی ایک حقیر بوند سے تیری تخلیق ہوئی ہے لیکن اس حقیر بوند کا کرشمہ دیکھ کہ وہ تندرست و توانا بدن کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اپنے بدن کی مضبوط ہڈیوں پر نگاہ ڈال۔ جسم کے رگ و ریشے اور جگر کو دیکھ وہ کیسا عجیب و غریب کارخانہ ہے جس سے بیسیوں قسم کے افعال وابستہ ہیں۔ قلب کی حیرت انگیز کار فرمائیوں پر نظر کر، خون کی صفائی کے نظام، گردوں اور معدہ کے افعال کو دیکھ اور حنجرہ و پھیپھڑوں کی حرکات پر غور کر کہ یہ سب کے سب کس طرح اپنے اپنے کاموں پر مامور کر دیئے گئے ہیں۔

اپنے احساسات و ادراکات کا شعور پیدا کر، حافظہ اور حس مشترک، نیز قوت تخیل کے بارے میں سوچ بچار سے کام لے۔ کیا یہ سب کچھ تیری عظیم صلاحیتوں کا ثبوت نہیں، اور کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ تمام صلاحیتیں تیری اپنی ذات نے خود پیدا کر لی ہیں؟

نفس چونکہ ہنوز امارگی کی حالت میں ہوتا ہے اس لئے بہانے تلاش کرتا اور اچھل پڑتا ہے اور کام کو اپنی ہی ذات کا کرشمہ قرار دیتا ہے نیز قانون فطرت کے خلاف پکار اٹھتا ہے کہ یہ سب کچھ اپنے آپ ہو گیا ہے۔ غرضیکہ طرح طرح کی تاویلات کرتا اور شک و شبہ میں مبتلا ہو کر بندہ ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ کیونکہ امارگی کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرے۔

"بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ"

(سورہ القیامۃ - آیت ۵)

ہر چند کہ اس کے کانوں میں معاد کے بارے میں دعوت حق کی آواز برابر پہنچتی رہتی ہے کہ اے انسان جس وقت تیرا یہ بدن باقی نہ رہے گا۔ اس وقت عدل الٰہی کے ہاتھوں ہر فرد کو اپنے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ اگر عمل اچھا کیا ہو تو اس کی جزا بھی اچھی ہوگی لیکن اگر برائیوں کا ارتکاب کیا ہوگا تو اس کی سزا بھی پائے گا۔

قرآن مجید میں معاد کے بارے میں جو دلائل وارد ہوئے ہیں ان پر خوب غور کرو۔ سورہ واقعہ تو ان براہین و دلائل سے بھرا پڑا ہے۔ نیز دوسری متعدد سورتوں میں بھی اس کا تذکرہ آیا ہے۔

نفس امارہ شتر بے مہار ہے

نفس امارہ تو عیش و عشرت کی زندگی سے دست بردار ہونے نہیں دیتا۔ جو شخص مقامات عالیہ سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے اور ان کی نعمتوں سے سرفراز ہونا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ اپنی زبان، اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں کو قابو میں رکھے لیکن نفس امارہ کسی قید و بند اور پابندی کو قبول کرنا نہیں چاہتا اور قیامت کے واقع ہونے سے بھی انکار کر دیتا ہے اور بزعم خود یہ کہنے لگتا ہے کہ اس دوسری دنیا سے کون لوٹ کر آیا ہے جو آخرت کی خبر دے سکے۔ وہ چند روزہ حیات مستعار پر نازاں و فرحاں زندگی گزارنے پر مصر ہوتا ہے جس میں نہ تو کوئی پابندی ہو اور نہ کسی قسم کا جبر۔ ہر وقت اس پر دولت سمیٹنے کا جنون سوار رہتا ہے پھر معاد کی فکر لاحق ہو تو کیونکر؟ معاد کا قائل ہو جائے تو وقف کے مال میں تصرف بے جا پر کس طرح قادر ہو سکتا ہے۔؟

نفس امارہ دولت جمع کرنے کی دھن میں معاد سے بے نیاز اور غافل ہو کر اپنی جواب دہی کے خیال کو خاطر میں نہیں لاتا لہذا اسے پیٹ بھرنے سے غرض ہوتی ہے خواہ وہ حرام کی کمائی سے ہو یا حلال ذرائع سے۔ نفس امارہ تو ایک شتر بے مہار ہے اور اسی عالم میں زندگی گزارنے پر اکتفا کرتا ہے۔ معاد یا قیامت کے خوف کو دل میں پھٹکنے بھی نہیں دیتا اور حشر و نشر کو رجعت پسندوں کے ڈھکوسلے قرار دیتا ہے کہ یہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں جن کی کوئی وقعت نہیں۔ نفس کی امارگی کا ایک اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپکو حاکم مطلق سمجھنے لگتا ہے کہ اس سے باز پرس یا اس کی سرزنش کا کسی کو حق نہیں۔ اس کے خیال میں حلال و حرام کی تفریق بے جا پابندیاں عائد کرتی ہے۔ اس کے نزدیک ہر قسم کا مال کھانا روا ہے چاہے یتیم کا مال ہو یا تجارت میں دھوکہ دیکر یا گناہوں میں ملوث ہو کر حاصل کیا جائے۔ امارگی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ آنکھوں پر کوئی روک ٹوک نہ ہو ہر قسم کے حرام مناظر سے لطف اندوز ہونا اس کا حق ہے غرضیکہ وہ اپنی امارت اور حکومت کے زعم باطل میں مبتلا ہو کر ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد رہنا چاہتا ہے اور اس پر اسے اصرار بھی ہوتا ہے۔

نفس تو ایک اژدھا ہے۔

تم نے یہ تو سنا ہو گا کہ نفس کافر ہوتا ہے کیونکہ نفس کی امارگی تمام تر کفر ہی کفر ہے اور نفس امارہ کا حامل نہ صرف اپنے آپ کو حاکم مطلق سمجھتا ہے بلکہ امارگی کے نشہ میں سرشار ہو کر وہ خدا کا مدمقابل بن بیٹھتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ ربوبیت اور الوہیت کا دعوی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اسی گھمنڈ میں وہ چاہتا ہے کہ گردش افلاک محض اس کے اشارہ کی

تابع ہو جائے۔ کوئی واقعہ اس کی مرضی کے مطابق ہو تو پھولا نہیں سماتا اور اگر اس کی خواہش کے خلاف کوئی صورت حال رونما ہو تو بالکل ایک اژدہے کی طرح غیظ و غضب میں پھنکارنے لگتا ہے اور سارے عالم کو تہ و بالا کر دینا چاہتا ہے۔

قضاء و قدر اور نفس امارہ۔

جب وہ دولت و ثروت کے پیچھے اندھا دھند بھاگنے لگتا ہے اور اتفاق سے حالات سازگار ہو جانے سے اس کے پاس دولت کے انبار جمع ہو جاتے ہیں پھر تو وہ اس خبط میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے اور دولت کی یہ فراوانی اس کی اپنی مساعی کا ثمر ہے۔ اپنے جھوٹے پندار میں وہ بڑے زور و شور سے یہ اعلان کرتا ہے کہ میری فکر، میری قوت بازو اور میرے موئے قلم ہی کی بدولت اتنا مال و متاع میرے ہاتھ آیا ہے یعنی میں نے یہ کچھ کیا تو مجھے اتنا کچھ حاصل ہوا۔ لیکن اگر فلک کج رفتار اس کی مراد پوری نہ ہونے دے مثلاً اس کا مال و متاع آتش زدگی کا شکار ہو جائے یا کوئی اور نقصان اٹھانا پڑے تو وہ غضبناک اور بے چین ہو جاتا ہے اور اضطراب کی کیفیت میں بوکھلا سا جاتا ہے۔

وہ پکار اٹھتا ہے کہ افلاک کی گردش اور اس عالم کے پورے نظام کو میری مرضی کا تابع ہونا چاہئے۔ خلاف مرضی کوئی واقعہ پیش آئے تو قضاء و قدر الٰہی بھی اس کے غیظ و غضب کی زد میں آجاتے ہیں۔ اس کا کوئی بیٹا مر جائے تو شکایت ہی نہیں بلکہ گستاخانہ کلمات کہنے سے بھی گریز نہیں کرتا کہ فلاں بڈھے یا فلاں بڑھیا کو تو چھوڑ دیا اور میرے جوان بیٹے کو موت کی نیند سلا دیا۔ اس کا

نفس امارہ دولت جمع کرنے کی دھن میں معاد سے بے نیاز اور غافل ہو کر اپنی جواب دہی کے خیال کو خاطر میں نہیں لاتا لہذا اسے پیٹ بھرنے سے غرض ہوتی ہے خواہ وہ حرام کی کمائی سے ہو یا حلال ذریعے سے ۔ نفس امارہ تو ایک شتر بے مہار ہے اور اسی عالم میں زندگی گزارنے پر اکتفا کرتا ہے ۔ معاد یا قیامت کے خوف کو دل میں پھٹکنے بھی نہیں دیتا اور حشر و نشر کو رجعت پسندوں کے ڈھکوسلے قرار دیتا ہے کہ یہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں جن کی کوئی وقعت نہیں ۔ نفس کی امارگی کا ایک اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپکو حاکم مطلق سمجھنے لگتا ہے کہ اس سے باز پرس یا اس کی سرزنش کا کسی کو حق نہیں ۔ اس کے خیال میں حلال و حرام کی تفریق بے جا پابندیاں عائد کرتی ہے ۔ اس کے نزدیک ہر قسم کا مال کھانا روا ہے چاہے یتیم کا مال ہو یا تجارت میں دھوکہ دیکر یا گناہوں میں ملوث ہو کر حاصل کیا جائے ۔ امارگی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ آنکھوں پر کوئی روک ٹوک نہ ہو ہر قسم کے حرام مناظر سے لطف اندوز ہونا اس کا حق ہے غرضیکہ وہ اپنی امارت اور حکومت کے زعم باطل میں مبتلا ہو کر ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد رہنا چاہتا ہے اور اس پر اسے اصرار بھی ہوتا ہے ۔

نفس تو ایک اژدھا ہے ۔

تم نے یہ تو سنا ہوگا کہ نفس کافر ہوتا ہے کیونکہ نفس کی امارگی تمام تر کفر ہی کفر ہے اور نفس امارہ کا حامل نہ صرف اپنے آپ کو حاکم مطلق سمجھتا ہے بلکہ امارگی کے نشہ میں سرشار ہو کر وہ خدا کا مدمقابل بن بیٹھتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ ربوبیت اور الوہیت کا دعوی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا ۔ اسی گھمنڈ میں وہ چاہتا ہے کہ گردش افلاک محض اس کے اشارہ کی

تابع ہو جائے۔ کوئی واقعہ اس کی مرضی کے مطابق ہو تو پھولا نہیں سماتا اور اگر اس کی خواہش کے خلاف کوئی صورت حال رونما ہو تو بالکل ایک اژدہے کی طرح غیظ و غضب میں پھنکارنے لگتا ہے اور سارے عالم کو تہ و بالا کر دینا چاہتا ہے۔

قضاء و قدر اور نفس امارہ۔

جب وہ دولت و ثروت کے پیچھے اندھا دھند بھاگنے لگتا ہے اور اتفاق سے حالات سازگار ہو جانے سے اس کے پاس دولت کے انبار جمع ہو جاتے ہیں پھر تو وہ اس خبط میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے اور دولت کی یہ فراوانی اس کی اپنی مساعی کا ثمر ہے۔ اپنے جھوٹے پندار میں وہ بڑے زور و شور سے یہ اعلان کرتا ہے کہ میری فکر، میری قوت بازو اور میرے موئے قلم ہی کی بدولت اتنا مال و متاع میرے ہاتھ آیا ہے یعنی میں نے یہ کچھ کیا تو مجھے اتنا کچھ حاصل ہوا۔ لیکن اگر فلک کج رفتار اس کی مراد پوری نہ ہونے دے مثلاً اس کا مال و متاع آتشزدگی کا شکار ہو جائے یا کوئی اور نقصان اٹھانا پڑے تو وہ غضبناک اور بے چین ہو جاتا ہے اور اضطراب کی کیفیت میں بوکھلا سا جاتا ہے۔

وہ پکار اٹھتا ہے کہ افلاک کی گردش اور اس عالم کے پورے نظام کو میری مرضی کا تابع ہونا چاہیئے۔ خلاف مرضی کوئی واقعہ پیش آئے تو قضاء و قدر الٰہی بھی اس کے غیظ و غضب کی زد میں آجاتے ہیں۔ اس کا کوئی بیٹا مر جائے تو شکایت ہی نہیں بلکہ گستاخانہ کلمات کہنے سے بھی گریز نہیں کرتا کہ فلاں بڈھے یا فلاں بڑھیا کو تو چھوڑ دیا اور میرے جوان بیٹے کو موت کی نیند سلا دیا۔ اس کا

بس چلے تو وہ ملک الموت کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہے جس نے اس کو یہ دکھ پہنچایا ہے۔

خدا حکیم و علیم بھی ہے اور مدبر عالم بھی۔

اے نفس تو جو چاہے خیال کر لیکن اس کائنات میں ایک مدبر اور کارساز بھی ہے۔ کہو "الحمد للہ رب العالمین" وہی رب ہے اور وہی ہماری پرورش اور تربیت بھی کرتا ہے۔ وہی عالم ہست و بود کے انتظامات پر قادر ہے اور ہر فرد بشر کی تقدیر اس کے ہاتھوں میں ہے۔ اس نے ہماری زندگی کے ہر کام کے لئے ملائکہ مامور کر دیئے ہیں۔

"فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ"

(یس۔ آیت ۸۳)

حیات اور موت اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ وہی مارتا اور جلاتا ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کسی کے تن خاکی سے جان نہیں نکلتی۔ اس نے اپنی حکمت بالغہ کے مطابق ہر فرد کی اصلاح احوال کے لئے فرشتے مقرر کر دیئے ہیں۔

پس اے انسان۔ راہ اعتدال سے بھٹکنے میں تیری بھلائی نہیں۔ یہ خیال نہ کر کہ تیرا مال ہمیشہ رہنے والا ہے اور نہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو کہ یہ مال تیرے ہی ہاتھوں کا کمایا ہوا ہے۔ کفر کا راستہ اختیار نہ کر کیونکہ سارے امور مدبر الامر جل شانہ کی تدبیر کے پابند ہیں۔ اس کی مصلحت نے جتنا مناسب جانا عطا کر دیا۔ جس کی روزی کم کرنا چاہی کم کر دی۔ امارگی کی روش سے باز آجا اور

اپنے آپ کو خدا کا ہمسر نہ بنا۔ نیز اپنی رائے کو خدا کی مرضی اور مصلحت و حکمت کے مقابلہ میں مقدم نہ سمجھ۔ بندے کو چاہیئے کہ تسلیم و رضا سے کام لے اور خدا کی طرف سے جو کچھ بھی اس کے لئے پسند کیا جائے اس کو بلا چون و چرا قبول کرلے۔

اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے اسی میں بھلائی ہے۔

اولاد کی موت کا حادثہ بھی ان حوادث میں سے ایک ہے جس کو خالق حقیقی نے مقدر فرما دیا ہے اور مصلحت خداوندی کے تحت ہی کسی نوجوان کی وفات واقع ہوتی ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ

(سورہ الحدید۔ آیت ۲۲)

ایسے میں شکایت کیوں؟۔ اس کی تلافی کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو وعدے فرمائے ہیں ان پر نظر ہونی چاہیئے۔ ہر کام کا اجر خدا کے ذمہ ہے۔ لہٰذا قدرت کے کاموں پر ناراض ہو جانا کوئی عقلمندی نہیں۔ راضی برضا ہونے میں ہی فلاح و نجات ہے اور قیامت کے دن اس کا اجر ضرور ملے گا۔ اے انسان تیرا رازق تو خدا ہی ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ پردہ غیب سے اس کی مصلحت اور حکمت کس طرح ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اپنی حکمت سے بندے کے لئے وہی مقدر کر دیتا ہے جس میں اس کی بھلائی ہوتی ہے۔ اس کے حکم کے بغیر اس عالم ہستی میں کوئی پتا تک درخت سے نہیں گرتا۔ تیری اولاد کی موت بھی اس کے اذن اور اسکی مشیت کے بغیر واقع نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کی مشیت اور

اس کے حکم میں جو مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے وہ ہر شخص کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

مصلحت خداوندی سے بے خبری ہی بے صبری کا اصل سبب ہے

اے نفس شکر و صبر کو اپنا شعار بنا۔ حیلے بہانوں اور شکایتوں سے کام نہ لے۔ لیکن ایسا شکر و صبر، جو مجبوری کی بنا پر نہیں بلکہ "امر بین الامرین" کا مظہر ہو۔ یعنی اعتدال کے راستہ پر گامزن ہو جا جس میں تیرا اختیار باقی رہے اور جبر کا دخل نہ ہو۔ البتہ یاد رکھ تیرا اختیار بھی اذن الٰہی اور مشیت الٰہی کے مطابق ہو تو تیرے ہاتھوں وہ کام ضرور انجام پائے گا ورنہ وہ نہ چاہے تو تیری ہر تدبیر ناکامی سے بدل جائیگی۔

حقیقت یہ ہے کہ سارے واقعات اور حوادث جو رونما ہوتے ہیں یا رونما ہونے والے ہوں لوح محفوظ میں لکھدیئے گئے ہیں اور ان کی حیثیت تقدیر الٰہی کی ہے لہذا جو کچھ مقدر ہو چکا ہے اس پر راضی رہنا چاہیئے۔ لیکن نفس امارہ اس حقیقت پر کوئی دھیان نہیں دیتا اور صبر و شکر پر آمادہ نہیں ہوتا۔

ایسی بے صبری جس میں شکایت یا اعتراض کا پہلو ہو حرام ہے۔

کسی کی موت پر اس طرح گریہ وزاری کرنا جس میں خدا سے شکایت اور قضا و قدر الٰہی پر اعتراض کا پہلو نکلتا ہو حرام ہے۔ کپڑے پھاڑ لینا سر پیٹنا سینہ کوبی کرنا یہ سب ایسی حرکات ہیں جن کے ذریعہ امر الٰہی پر اعتراض یا شکایت مقصود ہو تو یہ سب حرکات حرام کے زمرے میں آتی ہیں۔ اس بارے میں متعدد رسالے موجود ہیں جن کو پڑھنے سے مزید تفصیل سے آگاہی ہو

سکتی ہے۔ آخر انسان کو خالق حقیقی کی قدرت کاملہ پر اعتراض کیوں ہے؟ جان تو اس کی دی ہوئی ہے اور وہی اپنی دی ہوئی شے واپس لینے پر بھی قادر ہے۔

نفس کی امارگی اور جہنم کی طرف لے جانے والے اعمال:

قضاء و قدر الہٰی پر اعتراض ہی سے نفس کی امارگی کا آغاز ہوتا ہے۔ کیونکہ اس حالت میں وہ صریحاً کفر خداوندی اور شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور قضا اتنی مذموم نہیں کہ خدا کی حکمت و مصلحت کو بلا چون و چرا قبول نہ کرے قضا و قدر الہٰی پر اعتراض شروع کردے۔ مثلاً یہ کہ زلزلہ کیوں آیا؟ بارش کیوں نہیں ہوئی؟ وغیرہ اس قسم کی باتیں سیدھے جہنم کی طرف لے جانے والی ہیں۔ جبکہ تسلیم و رضا جنت کی ضمانت ہے۔ حقیقی معنوں میں ایمان باللہ پیدا ہوجائے تو اس سے بڑھکر خوش بختی کیا ہوسکتی ہے۔

ایک اندھے اور مفلوج کا قصہ، جو ہر حال میں صابر و شاکر تھا:

حضرت موسیٰ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اپنے محبوب ترین بندے سے ان کی ملاقات کروادے۔ وحی نازل ہوئی کہ فلاں مقام پر جاؤ تو اس سے مل سکو گے۔ جب موسیٰ وہاں پہنچے تو ایک مریض کو دیکھا جو اندھا اور مفلوج بھی تھا۔

حضرت موسیٰ اس کے قریب جاکر بیٹھ گئے اور اس کا حال احوال دریافت کرنے لگے۔ یہ ورد کررہا تھا "اے نیک بندوں کے خدا" حضرت موسیٰ نے پوچھا کہ تم اندھے بھی ہو اور مفلوج بھی، پھر تم کس طرح خدا کی نعمتوں

کے شکر گزار ہو اور خدا کی حمد و ثناء سے غافل نہیں ہو۔ اس نے جواب دیا کہ ایک مدت تک میری آنکھیں صحیح و سالم تھیں اور میں اپنی زندگی کی ضروریات بخوبی پوری کرنے کے قابل تھا، حرام اور شہوت انگیز مناظر پر میری نظر نہیں پڑتی تھی لہذا اللہ تعالیٰ نے میری آنکھیں ہی واپس لے لیں تاکہ حرام میں میری نگاہ نہ پڑنے پائے۔ اس نے مجھے پاؤں بھی دیئے اور میں نے ان سے کما حقہ استفادہ کیا۔ کہیں کسی حرام جگہ پر میرا پاؤں پڑنے نہ پایا۔ اس لیئے اس نے میرے پاؤں واپس لے لیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس عالم ہست و بود میں، جس میں ہم رہتے ہیں اس نے مجھے ایسی نعمت سے نوازا ہے کہ کسی اور کو نہیں دی۔ پھر کیوں نہ اس کی نعمت کا شکر ادا کروں؟

حضرت موسیٰ نے پوچھا۔ وہ کونسی نعمت ہے؟۔ اس نے جواب دیا کہ ایمان کی نعمت۔

بدن صحیح و سالم اور دل بے چین:۔

تم دیکھتے ہو کہ بدن صحیح سالم ہوتا ہے لیکن اس بدن کے اندر جو دل ہے اس میں جہنمی خیالات موجزن رہتے ہیں۔ کیونکہ نفس کی امارگی نے خدا کی ناشکری اور کفر پر مائل کر کے اس کے اندر جہنم کی آگ بھڑکا دی ہے۔ شکوک و شبہات نفس کی حکمرانی اور خواہشات کی غلامی کے نتیجے میں اس کی نیندیں حرام کر دیتے ہیں۔ پس مومن کو چاہیئے کہ نفس کی امارگی سے چھٹکارا پاکر کامل یقین و ایمان کے رتبہ پر فائز ہونے کے لئے کوشاں رہے۔ بیجا خواہشات اور تمناؤں کو دل میں جگہ نہ دے۔ امارگی سے نجات کی کھلی نشانی یہ ہے کہ اگر اپنی کسی خواہش کو دبانے سے محبوبیت کے تقاضوں کے برخلاف کوئی ایسی

حرکت سرزد ہو جائے۔ جس سے اس کی خودی مجروح ہوتی ہو تو اس کا دل بے چین و ملول ہو جاتا ہے یہی ایمان کی بھی سب سے بڑی نشانی ہے جس کے بعد اس کا نفس امارگی سے لوامگی کی حالت میں داخل ہوتا ہے۔ وہ اپنے گناہوں پر خود ہی لعنت ملامت کرتا ہے کسی اور کو مطعون کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔
کسی نے کیا خوب کہا ہے۔
"جب کسی پر خدا کی رحمت ہوتی ہے تو اس کی ذات کے اندر ہی ایک ناصح پیدا ہو جاتا ہے"۔

خدا چاہے تو تیرے اندر ہی ایک ناصح پیدا ہو جائے:۔

میں، میں کہنا چھوڑ دے اگر کوئی تیری تعریف کرنے لگے اور تیرا نفس ہنوز امارگی کی حالت میں ہو تو، تو بھی اس کی ہاں ہاں میں ملائے گا اور خوش ہوگا لیکن اگر نفس امارہ سے تو نے چھٹکارا پالیا ہے تو اس بات پر تو محزون و ملول ہوگا۔ اس خیال سے کہ یہ حرکت آداب بندگی کے منافی ہے۔ نیز خود کو ملامت کرے گا کہ مجھ سے یہ کیسی حرکت سرزد ہو گئی اور یہ کیسے الفاظ میری زبان سے جاری ہو گئے، اور کہے گا "استغفر اللہ" یا اللہ! مجھے معاف فرما اور میری بخشش فرما۔
"فَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ" لوامگی گویا عبودیت کا پہلا زینہ ہے۔
اگر اپنے آپ کو اس حال میں پائے تو خدا کا شکر بجالا کہ تو ایمان پر چل پڑا ہے اور علی علیہ السلام کی صراط مستقیم پر گامزن ہے تجھے چاہیئے کہ اس راستے پر استقامت سے مسلسل چلتا رہے تاکہ جب کبھی کوئی خطا یا لغزش ہو جائے تو خود کو ملامت کرنے لگے۔

بعض بزرگوں نے تو اپنے نفس کو ملامت کرنے میں عجیب و غریب کارنامے انجام دئے ہیں مثلاً کبھی کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اپنے آپ کو سزا دینے کی خاطر ایک سال تک ٹھنڈا پانی اپنے اوپر حرام کر لیا۔

نفس پر نیکی اور بدی ہر دو کا الہام ہو سکتا ہے۔

نفس جب لوامگی کے درجہ پر پہنچ جائے تو الہام کا مرحلہ شروع ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے۔ "فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا"۔ الہام وارد ہو تو خیر و شر کی پہچان ہونے لگتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے۔ اگر الہام ہو تو بہت سارے کام ایسے انجام پاتے ہیں جو بظاہر تو بھلے لگتے ہیں لیکن دراصل گناہ کے زمرے میں آتے ہیں۔ مثلاً ریاکاری یا غرور و تکبر۔ لیکن الہام کی بدولت وہ ان برائیوں سے بچا رہتا ہے۔ جب یہ منزل طے ہو چکتی ہے تو پھر نفس مطمئنہ کا مرحلہ آتا ہے۔ یعنی ایمان کے بارے میں بھی اس تعلق سے کوئی تردد یا شک و شبہ پیدا نہیں ہونے پاتا اور نہ ہی کسی اور کا اتباع اور تقلید قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔

نفس کی خواہشات و شہوات اور تمناؤں کا کوئی وجود نہیں رہتا بلکہ نفس کی خواہشات کی جگہ، رضائے الٰہی لے لیتی ہے یعنی جب شیطان نکل بھاگتا ہے تو فرشتہ داخل ہوتا ہے۔

جب ایمان کامل کی بدولت نفس پوری طرح مطمئن ہو جائے تو تسکین و سکون کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کے دلوں میں خود سکینت کا نزول فرماتا ہے تاکہ ان کا ایمان مزید پختہ ہو جائے۔

هُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِہِمْ

(سورہ فتح - آیت ۴)

طمانیت نفس کے اثرات۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکینت آرام و سکون کا باعث بنتی ہے اور نفس کسی قسم کی بے چینی و اضطراب کا شکار نہیں ہونے پاتا اور اس خیال پر مضبوطی سے قائم رہتا ہے کہ بندگی صرف خدائے واحد کے لیئے ہے۔ اور اس پر یقین رکھتا ہے کہ اسکی روزی تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ

(الذاریات - آیت ۵۸)

کیونکہ وہی رزاق ہے اور کہتا ہے کہ میں خالی ہاتھ آیا تھا اور خالی ہاتھ ہی اس دنیا سے جاؤنگا اور جب تک زندہ ہوں میرا رزق اور روزی اسی کے ذمہ ہے۔

دیوالیہ تاجر کا قصہ۔

اسی شہر شیراز میں قریب چالیس پچاس سال قبل ایک تاجر رہا کرتا تھا جو بڑا مقدس اور مشہور تھا اور بڑی عبادت کیا کرتا تھا اتفاق ایسا ہوا کہ وہ دیوالیہ ہوگیا۔ اس نے خانہ نشینی اختیار کرلی اور اپنے بچے کھچے اثاثے فروخت کرکے گزر بسر کرنے لگا۔

ایک دن اس نے اپنے تئیں سوچنا شروع کیا کہ اگر میں اسی طرح ہر روز اپنا اثاثہ فروخت کرتا رہا تو یہ کتنے دن کام آئے گا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ تین سال سے زیادہ کام نہ چلے گا۔ یہ خیال اس کے دل میں گھر کر گیا اور اپنے آپ سے یوں گویا ہوا کہ تین سال بعد تو میں گلیوں کی خاک چھانتا پھرونگا اور بھیک مانگنے کی نوبت آئے گی۔ یہی سوچ کر اس نے زہر کھا لیا اور خودکشی کی موت مر گیا۔

ایمان ہی کمال طمانیت ہے۔

اس تاجر کو اپنی عبادتوں کے باوجود طمانیت نفس حاصل نہ تھی اور قضا۔ وقدر الہٰی پر ایمان رکھنے کے بجائے اس نے کفر کا راستہ اختیار کیا اور اسی کفر کی حالت میں دنیا سے چل بسا۔

میں نے یہ واقعہ جو بیان کیا ہے اسے معمولی نہ خیال کریں۔ دین کی روح تو ایمان ہے اور حق بھی ہے۔ اس لئے ہر شخص کو طمانیت نفس کے حصول کی خاطر کوشاں رہنا چاہیئے۔ کیونکہ اطمینان کلی اور صبر و شکر میں کمال تو صرف ایمان ہی سے حاصل ہو سکتا ہے یعنی "اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ"۰

یوم عاشورہ میں حضرت امام حسینؑ کا سکون۔

اب میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اس آیت شریفہ کی تطبیق کس طرح حضرت امام حسینؑ پر ہوتی ہے۔

حضرت امام حسینؑ بدرجہ اتم نفس مطمئنہ کے حامل ہیں اور اس آیت کا تمام تر مصداق شہادت کے بارے میں لکھی ہوئی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے کہ عاشورہ کے روز حضرت امام حسینؑ پر جو بھی نئی مصیبت پڑتی ہر مرتبہ چہرہ مبارک زیادہ روشن ہو جاتا اور زیادہ کھل اٹھتا۔ یہ سکون اور طمانیت عجیب و غریب تھی کہ قضاء وقدر الہیٰ اور مرضی خداوندی ہی آپ کے چہرے سے آشکار ہو رہی تھی کیونکہ آپ کو کامل یقین تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ منجانب اللہ ہے اور اس میں بھی اسی کی مصلحت کارفرما ہے۔ اس لئے آپ نے اس کے سدباب یا جوابی کارروائی کا ارادہ نہیں کیا۔

یہ کوئی مجبوری نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہی مرضی تھی کہ حضرت امام حسینؑ بااختیار ہونے کے باوجود ان مصائب کو جھیل جائیں تاکہ ایک بشر کے لئے جو بلند سے بلند مقام ہو سکتا ہے اس تک آپ کی رسائی ہو جائے۔ اس طرح کہ آپ کے قاتلوں کی بے رحمی اور شقاوت اس کے لئے انتہائی بدبختی کا موجب بن جائے۔

چونکہ خدا دیکھ رہا ہوتا ہے اس کے لئے ہر کام آسان ہو جاتا ہے۔

حضرت امام حسینؑ دیکھ رہے ہیں کہ ان کا ایک طفل شیر خوار خود ان کے ہاتھوں میں ہے اور ظالموں نے اسے قتل کر دیا ہے۔ یہ اتنی بڑی مصیبت

تھی کہ پہاڑ بھی لرز اٹھتے اور دیکھنے اور سننے والوں پر سکتہ طاری ہو جاتا لیکن حضرت امام حسینؑ جو نفس مطمئنہ کے حامل تھے فرمانے لگے۔

"اِنَّمَا هَوَّنَ عَلَیَّ ذَالِکَ اِنَّہٗ بِعَیْنِ اللّٰہِ النَّاظِرِ"

یعنی اللہ تعالیٰ میرے لئے یہ مصیبت آسان کر دے گا کیونکہ یہ سب کچھ اس خدائے بصیر کے سامنے ہو رہا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس عظیم مصیبت اور طفل شیر خوار کی ہلاکت کے جگر خراش داغ کو بھی آسان کر دیا کیونکہ حضرت امام حسینؑ کا خدا سب کچھ دیکھ رہا تھا اور وہی اس کی پاداش میں ان کے قاتلوں کو سزا بھی دے گا۔

وہ آخری لمحات میں خدا کے اتنے قریب ہو چکے تھے کہ خداوند عالم اور ملائکہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ گویا حضرت امام حسینؑ تو خدا کی طرف متوجہ تھے اور سارا عالم ان کی طرف متوجہ تھا۔

باب دوم

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ.

بدن اور روح کا تعلق

نفس کی معرفت یہ ہے کہ پہلے انسان خود اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرے تاکہ اس کو اپنی اصلیت کا علم ہو اور اپنی ابتداء کے بارے میں معرفت حاصل ہو جائے یعنی یہ جان سکے کہ اس کا یہ بدن یہ گوشت و پوست یہ ہڈیاں اور رگ و پے دراصل روح کی کارفرمائی کے ذرائع ہیں۔ گویا ان کی آفرینش محض روح کی خاطر ہوئی ہے اور بدن کو اس کا تابع بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ نفس کو کمال تک پہنچانے کا ذریعہ ثابت ہو چنانچہ بدن ہی کے ذریعے ان کمالات کا ظہور ہوتا ہے۔ نفس کے لئے علم و عمل کی تحصیل بھی اسی بدن کے ذریعہ ممکن ہے۔ اسی بدن کے وسیلے سے وہ جزئیات عالم کے اسرار سے واقف ہو جاتا ہے اور اسے فطرت کے قوانین سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ اپنے انہی کانوں سے وہ کائنات میں ہر طرف نغموں کے سرور سے آشنا ہوتا اور اپنی اسی ناک کے ذریعہ دنیا میں پھیلی ہوئی مشام جانفزا کی خوشبو کا ادراک کرتا ہے۔

آنکھیں اور کان عظمت خداوندی کے ادراک کا ذریعہ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ بدن ہی روح کی ادراکات کا وسیلہ بن جاتا ہے اور جزئیات کا ادراک کرتے کرتے اس کی رسائی کلیات تک ہو جاتی ہے۔ جو کچھ

دیکھتا سنتا اور سونگھتا ہے وہ سب اس کے لئے عظمت خداوند کے شواہد بن جاتے ہیں اور جب اتنی سمجھ آجاتی ہے تو بے ساختہ پکار اٹھتا ہے "اللہ اکبر" گویا عقل جس طرف رہنمائی کرے اس کے مطابق اس کی زبان بول اٹھتی ہے۔

اسے جس بات کا ادراک ہوتا ہے اور اس کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ خدا کی نعمت ہی تو ہے اور الحمدللہ کہہ کر اس کی زبان اسے آشکار کر دیتی ہے۔ غرضیکہ بدن کی حیثیت روح کے لئے وسیلہ کا درجہ رکھتی ہے۔

اعضائے جسم روح کی کارفرمائی کا وسیلہ ہیں۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ ہر کام کو انجام دینے کے لئے وسائل اور ذرائع درکار ہیں۔ لہذا روح جس وقت تک اس کالبد خاکی میں رہتی ہے اس کو بھی اعمال خیر کے لئے کوئی نہ کوئی ذریعہ چاہیئے۔ پس انسان کے ہاتھ پاؤں روح کے لئے ہی کام انجام دیتے ہیں۔ ورنہ ہاتھ کے بغیر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ کسی گرے ہوئے بوجھ کو اٹھا سکے اور کسی کی مدد کر سکے۔

اسی طرح خیر کا ایک کام یہ ہے کہ میاں بیوی کے مابین مصالحت کرادی جائے۔ لیکن زبان نہ ہو تو وہ کس طرح دونوں کے مابین فتنہ و فساد کی آگ کو الفاظ کے ذریعہ بجھا سکتا ہے۔ پس زبان کے بغیر وہ اس کار خیر کی انجام دہی سے قاصر رہے گا۔

انسان کے پاؤں نہ ہوں تو وہ کس طرح مساجد تک پہنچ پائے گا یا عبادت خانوں، مجالس وعظ و تفسیر میں شریک ہو سکے گا اور معارف الہیٰ سے آگہی حاصل کر سکے گا۔

غرضیکہ ہمارا یہ بدن روح کی کارفرمائی کیلئے وسیلہ کا کام دیتا ہے۔

علمی اور عملی قواء کا اظہار بدن کے بغیر ممکن ہی نہیں اور ان کاموں کی تکمیل بدن ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ اگر بدن اپنا کام چھوڑ دے تو روح کے کمالات بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ یہ بدن ہی کی برکت ہے کہ اللہ جل جلالہ نے روح کو انسان کے لئے مسخر کر رکھا ہے اور اس کا مطیع بنا دیا ہے تاکہ وہ بدن کے وسیلے سے اپنے کمالات کا اظہار کر سکے۔

جسم کائنات اور قدرت الہیٰ۔

جسم انسانی کے ساتھ روح کا تعلق ایسا ہی ہے جیسا کہ اس پوری کائنات میں قدرت الہیٰ کے آثار و شواہد موجود ہیں۔ جس سے پروردگار عالم کے بے انتہا ارادہ ازلی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح کہ خداوند کریم اپنے ارادہ مطلق سے جو چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے اسے وجود بخشتا ہے اور وہ ہو جاتا ہے

"اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔"

(سورہ یٰس۔ آیت۔ ۸۲)

روح کو بھی انسان کے جسم کے ساتھ یہی نسبت ہے اور خالق حقیقی نے ان دونوں میں ایسا تعلق پیدا کر دیا ہے کہ روح جو کوئی ارادہ کرتی ہے تو خواہ و نا خواہ جسم اسی کے مطابق حرکت پذیر ہوتا ہے۔

قدر خودت بدان و خدائے خودت را بشناس

یعنی اپنی قدر پہچان تاکہ اپنے خدا کی معرفت حاصل ہو۔

انسانی جسم کی یہ عظیم عمارت جس کے وجود کو خالق ارض و سمانے

سیکڑوں قوائے ظاہری و باطنی پر قدرت بخشی ہے ان میں حواس خمسہ یعنی لامسہ ذائقہ باصرہ سامعہ اور شامہ کے علاوہ حافظہ اور واہمہ و مخیلہ نیز قلب کی کارکردگی گردوں اور معدہ کے وظائف اور نظام ہضم و نظام تنفس وغیرہ سب شامل ہیں اور بدن میں ان کی ساخت و تشکیل اس طرح کی گئی ہے کہ سب کے سب روح کے اختیار میں دیدئے گئے ہیں۔

روح کی مشیت اور جسم انسانی۔

جب تم کہیں جانے کا ارادہ کرتے ہو تو اس کی ضرورت نہیں پیش آتی کہ اپنے پیروں سے کہو کہ چل بڑھو۔ پاؤں خود بخود اٹھتے ہیں اور تم چلنے لگتے ہو۔ اسی طرح ارادہ کرتے ہو کہ اپنا ہاتھ جیب میں ڈالیں تو ہاتھ فوراً ہی جیب میں پہنچ جاتا ہے اور ہاتھ کو یہ کہنے کی نوبت نہیں آتی کہ جیب میں داخل ہو جا۔ پھر آنکھ کا کرشمہ دیکھو کہ جب تم کسی کی طرف نگاہ ڈالنے کا ارادہ کرتے ہو تو نگاہیں خود بخود اس طرف اٹھ جاتی ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ آنکھوں کو ایسا کرنے کے لئے کہنا پڑے۔ پس سارے کے سارے اعضائے جسم میں روح کی مشیت و ارادہ کی جس طرح کارفرمائی ہے وہ اس عالم موجودات میں ارادہ الہیٰ کے نفوذ کا چھوٹا سا نمونہ ہے۔

نفس ناطقہ کی قدرت۔

شیخ الرئیس بوعلی سینا نے اپنی کتاب الشفاء میں قوت کشش کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ مقناطیس کی

ایک معمولی سوئی کس طرح اپنے سے کئی گنا بڑے وزن کو اٹھا لیتی ہے حالانکہ تعجب تو اس پر ہونا چاہیئے کہ خود تمہارے بدن کے اندر تمہاری روح کس طرح جذب ہو چکی ہے اور تمہارے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

روح یا نفس ناطقہ کا یہ کمال ہے کہ محض اس کی قوت ارادی کی بدولت انسان پچاس ساٹھ کیلو وزن تک اٹھا لیتا ہے۔ کیا اس پر تعجب نہیں کہ خداوند عالم نے اس روح کو اتنی طاقت عطا فرمائی ہے؟

روح تن تنہا کئی آدمیوں کے کام کرتی ہے۔

جب روح جسم سے علیحدہ ہو جاتی ہے اور انسان مر جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ مردہ کی لاش کو چار آدمی اپنے کندھوں پر بمشکل اٹھاتے ہیں لیکن زیادہ فاصلہ طے نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس روح کو دیکھو کہ وہ کس طرح اسی بھاری بھرکم جسم کو کتنی آسانی اور سہولت کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ بلا تکلف لئے پھرتی ہے نہ صرف یہ بلکہ دوڑتی ہے اور اچھلتی کودتی ہے۔ کیا روح کا یہ کمال خدائے حکیم و دانا اور قادر مطلق کی قدرت کا ثبوت نہیں۔ پھر تم اس پر غور کیوں نہیں کرتے؟ کہو اللہ اکبر۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اس جسم کو میرے لئے مسخر کر دیا ہے۔

پس چاہیئے کہ پہلے اپنی روح مجرد اور نفس ناطقہ کی ذات و حقیقت کو پہچاننے کی کوشش کرو تاکہ اپنے خالق کی معرفت حاصل ہو سکے۔

حواس مادی ناقص ہیں۔

بعض جاہلوں کا کہنا ہے کہ جس چیز کو ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے اس پر کس طرح یقین کر لیں۔ اسی طرح مادیئین کہتے ہیں کہ انسان کے وجود میں گوشت و پوست کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ پس نفس یا روح کے وجود کو کس طرح مان لیا جائے۔ عین اسی طرز استدلال کو بنیاد بنا کر کم عقل اور کافر لوگ صانع حقیقی یعنی حق تعالیٰ کے وجود کا بھی انکار کر بیٹھے ہیں کہ جس خدا کو ہم دیکھ نہیں سکتے اس پر کس طرح ایمان لائیں۔

اس قسم کی طفلانہ باتیں بے شعوری کا نتیجہ ہیں کہ ہر وہ چیز جسے آنکھوں کے ذریعہ دیکھنا ممکن نہیں اس سے انکار کر دیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کسی چیز کا ادراک حس کے ذریعہ ممکن نہ ہو تو یہ حس کا نقص ہے یا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ چیز ہی موجود نہیں۔

بے شمار اشیاء ایسی ہیں کہ ان کی لطافت کے باعث آنکھ ان کو دیکھنے سے قاصر ہے درآں حالیکہ ان کا وجود ہے۔

ہوا اور برق بھی مرئی نہیں۔

کس کی مجال ہے کہ ہوا کے وجود سے انکار کر سکے؟ اگر ہوا نہ ہو تو کون زندہ رہ سکتا ہے؟ ہوا کے بغیر ہر جاندار دم گھٹ کر ہلاک ہو جائے۔ لیکن تمہاری آنکھ کیا ہوا کو دیکھ سکتی ہے؟ حالانکہ علوم طبیعیات کی رو سے یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ ہوا کئی عناصر کا آمیزہ ہے جس میں آکسیجن اور ہائیڈروجن شامل ہیں تم نہ تو ان عناصر کو اپنی آنکھ سے دیکھ سکتے ہو اور نہ ان

بجلی کے تاروں میں سب کو علم ہے کہ برق دوڑتی رہتی ہے لیکن کیا تم اس کو دیکھ سکتے ہو؟ اور کیا اس سے انکار کر سکتے ہو؟ اس بنا پر کہ تمہاری آنکھ اس کو دیکھنے پر قادر نہیں؟

معلول سے علت کا پتہ چلتا ہے۔

سارے موجودات عالم میں لطیف ترین شے عقل ہے۔ کسی کو بے عقل کہا جائے تو وہ برا مانتا ہے۔ لیکن یہ عقل کہاں ہے؟ اور کس طرح اس کو دیکھا جا سکتا ہے؟ حالانکہ سب کو اس کا یقین ہے کہ عقل موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معلول سے علت کا پتہ چلتا ہے اور آثار کے ذریعہ موثر کا۔ کسی راستہ پر اگر کسی سائیکل کے ٹائر یا انسان کے پیروں کے نشان ہوں تو تم سمجھ لیتے ہو کہ اس راستہ پر سائیکل یا انسان کا گزر ہوا ہے۔

روح کی دوبارہ تخلیق۔

تمہارا نفس ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ منور اور فعال جس کی بقاء اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور رحمت کی تابع ہے۔

قرآن مجید میں روح کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ وہ بدن سے علیحدہ چیز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ۔

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ.

(سورہ مومنون۔ آیت ۱۴)

اس کے بعد ہم دوسری مرتبہ تخلیق کرتے ہیں یعنی انسان کی تخلیق پہلے تو نطفہ سے ہوتی ہے پھر وہ علقہ یا جے ہوئے خون کی شکل اختیار کرتا ہے بعد ازاں مضغہ گوشت یا لوتھڑا بن جاتا ہے اور آخر میں پورے بدن کی تکمیل ہوتی ہے۔ اب اسکی دوبارہ تخلیق اس طرح ہوتی ہے کہ اس میں روح داخل ہوتی ہے۔ روح کے بدن سے جدا ہونے کے بعد بدن تو خاک کا پیوند ہو جاتا ہے۔ گوشت و پوست کا نام روح نہیں۔ گوشت پوست تو مرض میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ ضائع بھی ہو سکتا ہے اور اس میں خرابی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ لہذا تجھے چاہیئے کہ بدن کی اتنی فکر نہ کر۔ اصل فکر روح کی کرنی چاہیئے۔ کیونکہ تیرا حقیقی وجود تو روح سے وابستہ ہے بلکہ روح ہی اصل وجود ہے۔ یہ بدن تو روح کی سواری ہے جسے وہ وسیلہ کے طور پر استعمال کرتی ہے۔

شہداء زندہ جاوید ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ بقائے روح کے مسئلہ کو سمجھانے کے لئے ارشاد فرماتا ہے کہ خدا کی راہ میں مرنے والوں کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے ہاں سے انہیں رزق ملتا رہتا ہے۔ لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔

(سورہ البقرۃ۔ آیت۔ ۱۵۴)

گویا ہوتا یہ ہے کہ روح اپنے مرکب یعنی سواری کو چھوڑ کر پیادہ اور مجرد

شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور امام جعفر صادقؑ کی تشریح کے مطابق قفس میں گرفتار شدہ یہ پرندہ قفس سے آزاد ہو جاتا ہے۔ قفس یعنی بدن تو زیر خاک چلا جاتا ہے اور دفن کر دیا جاتا ہے تو پھر روح کہاں جاتی ہے؟ بقول شاعر۔

فراز کنگرہ عرش میزنند صفیر
ندانمت کہ درایں دامگہ چہ افتادہ است

بقائے روح

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ جب کسی پر خدا کی رحمت ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے (رَحِمَ اللّٰہُ اِمْرَءً عَرَفَ نَفْسَہٗ) اور یہ جان لیتا ہے کہ اس کی خودی محض گوشت پوست نہیں اور یہ کہ وہ صرف ایک حیوان نہیں بلکہ اس کی حقیقت کچھ اور ہی ہے جس کی بقاء اللہ تعالیٰ کی رحمت پر منحصر ہے۔ اور وہی روح ہے اور بدن جو اس کے زیر تصرف ہے پس ہر طرف روح ہی کی کارفرمائی ہے۔

روح کی یہ کارفرمائی جس کی صلاحیت اللہ رب العزت نے اس میں ودیعت کی ہے خدا کی قدرت اور اس کی کارفرمائی کی مظہر ہے۔ انسان کے بدن میں قدرت الہیٰ کے ظہور کا ثبوت یہ بھی ہے کہ ہمارا اپنا ارادہ ہمارے جسمانی حرکات پر نافذ العمل رہتا ہے۔ گویا ہر شے میں اسی کا حکم جاری و ساری ہے۔ یعنی کوئی بھی شخص کوئی سا کام کرے اس میں اسکے حکم اور مشیت کو دخل ہوتا ہے۔

عالم موجودات خدا ہی کا تخلیق کردہ ہے۔

تیرا یہ بدن تیری تخلیق نہیں لیکن اس میں پھر بھی تیرا عمل ودخل ہوتا ہے اور عالم موجودات تو خدا ہی کی مخلوق ہے لہذا اس میں حکم خداوندی کا نفوذ کیسے نہ ہو ۔ خدائے واحد کی ذات اقدس کے ارادہ کی اطاعت کائنات کا ایک ایک ذرہ بدرجہ اتم کرتا رہتا ہے ۔ اور وہ ہر آن معدوم کو موجود اور موجود کو معدوم نیز متصل کو منفصل اور منفصل کو متصل کرتا رہتا ہے ۔

انسان کے ادراکات روح ہی کا کرشمہ ہیں

بدن میں روح کی کار فرمائی کی مزید وضاحت کے لئے ہم مختلف مثالوں کے ذریعہ یہ ثابت کرینگے کہ روح اور بدن دو باہم مختلف چیزیں ہیں ۔ یعنی روح کا اپنا وجود الگ ہے اور بدن اپنا الگ وجود رکھتا ہے ۔

ہم یہ پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ آنکھوں اور کانوں یا ہمارے حواس کے ذریعہ روح کا ادراک ممکن نہیں جو اپنے وجود میں انتہائی لطیف شے ہے تاہم اس کے اثرات کا پتہ چلا لینا ممکن ہے ۔

بدن میں روح کے اثرات ہی ہمارے ادراکات ہوتے ہیں ۔ مثلاً تم راستہ سے جا رہے ہو اور یکایک تمہارے پاؤں کو کسی پتھر سے ٹھوکر لگ جاتی ہے یا پاؤں میں کوئی کانٹا چبھ جاتا ہے تو فوراً ہی اس سے واقف ہو جاتے ہو ۔ اسی طرح جسم کے ساتھ کوئی بھی حادثہ پیش آئے روح کو فوری اس کا علم ہو جاتا ہے ۔ یہ مثال ہے روح کے علم کی بدن کے تعلق سے تمہارے اپنے علم کا گویا یہی ذریعہ ہے جو تمہارے جسم کے ساتھ کسی حادثہ کے بارے میں تم کو

حاصل ہوتا ہے اللہ جل شانہ جو تمہاری روح اور بدن ہر دو کا خالق ہے اور کائنات کا کوئی واقعہ ہو بدرجہ اتم واکمل اس کو اس کا علم ہو جاتا ہے اور کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ نیز کائنات کے کسی گوشہ میں بھی کوئی حادثہ رونما ہو اس میں اس کے اذن اور مشیت کا دخل ہوتا ہے۔

حافظہ بھی نفس کے تجرد کی دلیل ہے۔

سب جانتے ہیں کہ روح مادی نہیں۔ لیکن انسان کے حافظہ کی قوت پر غور کرو کہ اوائل عمر ہی سے وہ کچھ دیکھتا اور سنتا ہے یا محسوس کرتا ہے وہ اس کے حافظہ میں محفوظ ہو جاتا ہے بلکہ اسی کو حافظہ کہتے ہیں۔

اگر کوئی شخص چاہے کہ اس نے اپنی پوری زندگی میں جتنی باتیں کہیں اور سنی ہیں یا جتنی چیزیں دیکھی ہیں ان کا شمار کرے تو کچی بات یہ ہے کہ اسے سرسام کا مرض لاحق ہو جائے حتی کہ تم اپنی ایک گھنٹہ میں کی ہوئی گفتگو کو سپرد قرطاس کرنا چاہو تو کتنے صفحات بھر جائیں۔ اندازہ کرو کہ زندگی کی باتوں کو جو تم نے سنی ہوں یا زبان سے کہی ہوں قلمبند کرنے کے لئے کتنی ضخیم جلدیں درکار ہونگی اور وہ کتنی جگہ گھیریں گی۔ کیا یہ بات باعث حیرت نہیں کہ یہ سب کچھ تمہارا حافظہ بلا تکلف محفوظ کر لیتا ہے۔

مدرکات نفس میں باہم کوئی اختلاف نہیں۔

انسان کا یہ نفس ناطقہ بھی عجیب شے ہے کہ اس کے متعدد ادراکات کے مابین باہم کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر آپ اپنے آپ سے سوال کریں

کہ کل میں نے کس شخص سے ملاقات کی تھی ۔ اس کا جواب پانے کے لئے لامحالہ آپ کو اپنے ذہن کے خزانچی اور محافظ سے رجوع کرنا پڑتا ہے چنانچہ آپ کا حافظہ جو آپ کی یادوں کا محافظ اور یادوں کے سرمایہ کا خزانہ دار ہے فوری جستجو شروع کر دیتا ہے اور کھوج لگا کر آپ کے سوال کا جواب مہیا کر دیتا ہے ۔

یہ بات ضرور ہے کہ کسی کا حافظہ قوی ہوتا ہے ۔ کسی کا کمزور ۔ اسی طرح ہر شخص میں بھول جانے کا رجحان بھی کم و بیش ہوتا ہے ۔ بعض لوگ جلد ہی کسی بات کو فراموش کر دیتے ہیں اور بعض لوگوں کے حافظہ میں وہی بات دیر تک محفوظ رہتی ہے ۔

نفس کی وسعت اور اسکے بے شمار ادراکات ۔

نفس کی وسعت اس قدر حیران کن ہے کہ اس میں بے شمار محسوسات و مدرکات تہ بہ تہ جمع ہوتے جاتے ہیں اور طرفہ یہ کہ مادی طور پر یہ جگہ بھی نہیں گھیرتے ۔ کیا اس بات کی یہ روشن دلیل نہیں کہ انسان محض مادی جسم کا نام نہیں ۔

اس مفہوم کی وضاحت کے لئے میں دو حکایتیں بطور مثال پیش کرتا ہوں ۔ ان حکایتوں سے خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ روح کی شناخت کیا ہے اور بدن میں اس کی کارفرمائی اور قدرت نافعہ کس حد تک حاوی ہے اور یہ کہ وہ بدن پر حکمران ہے نہ کہ بدن اس پر حکمران ہے ۔

خوارزم شاہ کا نفسیاتی علاج۔

کہتے ہیں کہ سلطان خوارزم شاہ کو فالج کا عارضہ ہوگیا تھا۔ متعدد طبیب علاج کرتے کرتے عاجز آچکے تھے لیکن اس کا مرض جوں کا توں برقرار رہا۔ اس دور کے مسلمہ طبیب حکیم محمد بن ذکریا رازی تھے۔ بادشاہ نے انہیں بلوا بھیجا حکیم رازی جب پہنچے تو اس وقت تک جو ادویہ استعمال کی جارہی تھیں وہ ان کے سامنے پیش ہوئیں۔ رازی نے بھی اپنی سی دوائیں تجویز کرکے علاج شروع کردیا لیکن بادشاہ کے مرض میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

طبیب رازی بہت غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس مرض کا علاج عام دواؤں سے ممکن نہیں اور اس کا صحیح علاج نفسیاتی طریقہ سے کیا جائے تو کارگر ہوسکے گا۔ رازی بڑے دانا حکیم و طبیب تھے انہوں نے نفسیاتی علاج شروع کردیا اور بادشاہ سے مخاطب ہوکر کہا کہ پہلے میرے لئے جان بخشی اور امان کی خاطر ایک حکم لکھ دیں کہ آپ کے علاج کی خاطر میں جو کچھ بھی کروں اس پر میری گرفت نہ ہوگی اور میری جان بخشی ہوگی۔ بادشاہ نے یہ امان نامہ لکھدیا تو رازی نے ایک گرم حمام تیار کرنے کا حکم دیا جس کا درجہ حرارت طبیب رازی کے اختیار پر ہو۔ اس زمانہ کا دستور تھا کہ حمام کو خوب گرم رکھا جاتا تھا اور ہوا کے گزرنے کے لئے راستہ نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ کو ننگ دھڑنگ حالت میں حمام کے بیچوں بیچ گرم گرم پتھروں پر بٹھا دیا گیا اور اسے اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ نیز پانی کی حرارت بھی خوب تیز رکھنے کے لئے مناسب اہتمام کردیا گیا۔ چند ہی گھنٹوں کے اندر اس روح فرسا گرمی میں بادشاہ کے جوڑ جوڑ کھل گئے اور ہڈیاں تک چلنے لگیں وہاں وہ یکہ و تنہا تھا اور مدد کے لئے کوئی موجود نہیں تھا۔

اس حالت میں طبیب رازی ننگی تلوار ہاتھ میں لئے حمام میں داخل ہوئے اور انتہائی فحش و نازیبا گالیاں بکتے ہوئے بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ اے بادشاہ میں نے یہ سب کھیل اس لئے کھیلا تھا کہ تجھے یکہ و تنہا اور نہتا پا کر مار ڈالوں کیونکہ تو نے بڑے بڑے ظلم کئے ہیں۔ اب میں اس تلوار سے تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دونگا اور یہ کہکر بادشاہ پر حملہ کر دیا۔

خوارزم شاہ پر موت کا خوف طاری ہوگیا اور وہ دہشت کے مارے اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور یکایک اس نے حمام کے تالاب میں چھلانگ لگادی، تاکہ رازی کے ہاتھ نہ آسکے۔

ایک فالج زدہ شخص جو عام روایتی دواؤں سے صحت یاب نہ ہو سکتا تھا اس کی شفا دراصل روح کے علاج میں مضمر تھی چنانچہ اس نفسیاتی علاج سے اس کے اعضاء خود بخود حرکت پذیر ہوگئے اور خوف و دہشت نے اس کے قواء کو بیدار کر دیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا اور فالج کا اثر زائل ہوگیا۔

بادشاہ کے تالاب میں چھلانگ لگاتے ہی طبیب رازی تو وہاں سے رفوچکر ہوگئے اور باہر آکر گھوڑے پر سوار۔ یہ جا۔ وہ جا۔ نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

خوارزم شاہ نے باہر آکر لباس زیب تن کیا اور زکریا رازی کو پیش کرنے کا حکم دیا لیکن اس کو بتایا گیا کہ وہ تو فرار ہو چکے ہیں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کو تلاش کر کے میرے حضور لے آؤ تاکہ انہیں انعام میں خلعت عطا کروں۔ لوگوں نے تلاش کر کے رازی کا پتہ چلا لیا۔ لیکن رازی نے کہا کہ خلعت سے میں ہاتھ دھوتا ہوں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ میں نے جو فحش گالیاں اور نازیبا کلمات بادشاہ کی شان میں کہے تھے اس سے بادشاہ ہنوز ناراض ہو گا اور کہیں اس کی سزا بھگتنی نہ پڑے۔

نفسیاتی علاج زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

اس حکایت کو بیان کرنے سے میری غرض روح یا نفس کی قدرت کو اجاگر کرنا تھا۔ واہمہ اور تخیلہ کی قوت اس قدر قوی ہوتی ہے کہ سارے بدن پر اس کی فعالیت حاوی رہتی ہے اور اس کی فعالیت میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ بدن پر دوسرے تمام اثرات خواہ دواؤں کے ہوں یا کسی اور طرح کے ان سب پر غالب آجاتی ہیں اور تیر بہ ہدف ثابت ہوتی ہے۔

لیکن یاد رہے کہ اس کے معکوس اثرات بھی ہو سکتے ہیں۔ جسمانی اعتبار سے صحت مند و تندرست آدمی کو نفسیاتی تلقین بیمار بنا دیگی اور اعتدال و توازن کے بگاڑ کا سبب بن جائے گی۔

مجرموں کی سزائے موت اور نفسیاتی طریقہ۔

کہتے ہیں کہ دو ملزموں کو جرم ثابت ہونے پر موت کی سزا دی گئی۔ اس سزا پر عمل کرنے کا جو طریقہ تجویز کیا گیا وہ یہ تھا کہ دونوں میں سے ایک کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور دوسرے مجرم کو اس کے سامنے اس طرح بٹھایا گیا کہ وہ اسے دیکھ سکے۔ جس کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی تھی اسے ایک نشتر چبھو کر زخمی کر دیا گیا۔ زخم سے خون بہتا رہا بہتا رہا یہاں تک کہ جسم کا سارا خون بہہ کر خارج ہو گیا اور دو تین گھنٹوں کے اندر چل بسا۔

دوسرا مجرم اپنی آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اب اس کی آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی گئی اور نشتر جسم میں چبھونے کے بجائے اس طرح لہرایا گیا کہ وہ بدن کو چھوتا رہے اور مجرم کو یہ محسوس ہو کہ اب اس کی باری

آنے والی ہے ۔ وہ چونکہ اپنے ساتھی کا حشر دیکھ چکا تھا اس لئے اس نے اپنے لئے سوچنا شروع کر دیا کہ اس کا بھی کام تمام ہونے والا ہے ۔ چنانچہ جب اس کے جسم میں نشتر چبھو دیا گیا تو بمشکل پانچ دس منٹ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ جگہ سے گر پڑا اور راہ عدم لی۔

نفسیاتی تلقین شفا بھی دے سکتی ہے اور بیمار بھی کر سکتی ہے۔

نفسیاتی تلقین کے موثر ہونے کو اب جدید دور کے اطبا بھی اہمیت دینے لگے ہیں ۔ مثلاً کوئی شخص اپنے آپ کو بیمار سمجھنے لگے تو خواب ایسے ہی دیکھے گا گویا وہ بیمار ہے۔

اسی طرح صحت و تندرستی کے بارے میں بھی تلقین موثر ثابت ہوتی ہے یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ کسی کو سانپ کاٹ لے اور جب تک اس کو نہ معلوم ہو کہ سانپ نے اس کو ڈسا ہے اس کے بہتر ہونے کی امید باقی رہتی ہے اور جب اس کو علم ہو جائے تو سانپ کے زہر کا علاج قدرے مشکل ہو جاتا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سانپ کے ڈسنے کا خوف اور دہشت ہی اس کے دوران خون کو متاثر کر دیتا ہے اور اس طرح زہر جلد ہی دل تک پہنچ جاتا ہے اور اپنا اثر کر جاتا ہے۔

ہم اور آپ محض بدن یا جسم نہیں ہیں ۔ یہ جسم تو ہمارے لئے سواری کا کام دیتے ہیں اور ہماری حقیقت کوئی ایسی شے نہیں جو بظاہر دکھائی دے کیونکہ وہ مادی نہیں ۔ ہاں اس کے اثرات سے وہ پہچانی جا سکتی ہے ۔ اسی کا اثر ہے کہ جسم حرکت کرتا ہے ۔ روح کی جو کار فرمائی ہمارے اجسام میں ہے اسی کا یہ کرشمہ ہے کہ ہم حافظہ کی قوت کے مالک ہیں اور حافظہ روح کے تجرد اور اس

کی بقاء پر شاہد ہے۔

روح کی کارفرمائیوں میں جسم کے اندر رونما ہونے والے دوسرے افعال مانع نہیں ہوتے۔

روح کی تجرید اور اس کی قدرت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ جسم کے دوسرے افعال اس کی کارفرمائی میں مانع نہیں ہوتے۔ جب لقمہ منہ میں پہنچتا ہے تو اس کی مٹھاس کا ادارک روح کو ہوتا ہے۔ دانت اس کو چباتے ہیں تو ذائقہ کا ادراک بھی روح کو ہوتا ہے۔ تم باتیں بھی کرتے رہتے ہو اور اسی حالت میں تمہاری آنکھیں بھی کام کر رہی ہوتی ہیں۔ کان اپنا کام کر رہے ہوتے ہیں اور دانت بھی چبانے کا کام جاری رکھتے ہیں اور تم غذائی لذت سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہو۔ باتیں بھی کئے جا رہے ہو اور ممکن ہے کہ اسی دوران اپنے حافظہ کی مدد سے تم سوچنے اور کسی بات کے متعلق فکر کرنے میں بھی مشغول ہو جاؤ۔ مثال کے طور غذا ہی کے بارے میں کہ یہ خوراک تم کھا رہے ہو بہتر ہے یا وہ غذا جو تم نے پہلے کھائی تھی۔ پھر یہ کہ اس غذا کے خواص کیا ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تمہارا بدن اپنے فرائض کی انجام دہی میں برابر منہمک ہے۔ اس کی حس لامسہ اپنا کام جاری رکھتی ہے۔ دل کے کام کی بجاآوری میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ تمہارا نظام تنفس بھی کام کر رہا ہوتا ہے۔ قوائے باطنی اور نظام ہضم بھی اپنے اپنے فرائض میں مشغول ہیں۔

سانس لینے کے لئے متبادل راستے مہیا کرنے میں بھی حکمت الہیٰ پوشیدہ ہے۔

حکمت الہیٰ نے ہماری ضروریات کے پیش نظر سانس لینے کے دو متبادل راستے مہیا کر دیے ہیں۔ یعنی حلق کے راستے سانس لینا مشکل ہو اور منہ میں کھانے کا لقمہ موجود ہو تو ناک کے دو سوراخ تنفس کے نظام کو برقرار رکھنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ گویا نظام تنفس کو ایک فاضل پرزہ یا ریزرو بھی فراہم کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کھانے کا لقمہ منہ سے باہر نکالے بغیر سانس لینے میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی۔

نیز ناک کے دو سوراخ رکھنے میں بھی یہ حکمت کارفرما ہے کہ اگر سردی اور نزلہ کے باعث ایک بند ہو جائے تو متبادل سوراخ موجود ہو جس سے سانس لینا ممکن ہو۔

اسی طرح سونے میں جبکہ منہ بند رہتا ہے ناک ہی تنفس کے نظام کو برقرار رکھنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور اگر ناک کے دونوں سوراخ کسی عارضہ کے باعث بند ہو جائیں تو پھر منہ کے راستے تنفس کا عمل جاری رہتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کی جسمانی ساخت اس طرح کی گئی ہے کہ ایک وقت میں جسمانی نظام کے سیکڑوں کام ایک ساتھ جاری رہتے ہیں۔ یہ قدرت خداوندی کی حکمت بالغہ ہے تاکہ انسان اس کی معرفت حاصل کر سکے۔

موت کے وقت قدرت الہیٰ آشکار ہوتی ہے۔

اہل بیتؑ کی مناجات اور دعائیں جو ہم تک پہنچی ہیں حکمت سے

بھرپور ہیں اور حقائق کا خزانہ ہیں تاکہ ہم ان کی برکات سے معارف تک رسائی حاصل کر سکیں اور خدا کو پہچان سکیں۔

منجملہ جوشن کبیر نے بھی یہ دعا نقل کی ہے جس کو توجہ کے ساتھ ہمیشہ ورد کرنا چاہیئے۔ بالخصوص ماہ رمضان المبارک اور شب قدر کے موقعوں پر اس دعا کی بڑی تاثیر ہے۔ اس مناجات کا ایک جملہ محض یاد دلانے کی خاطر درج کرتا ہوں کہ "یامن فی الممات قدرتہ" جو شخص بھی خدا کی قدرت کو سمجھنا چاہے اسے اپنی موت کو بھولنا نہیں چاہیئے بلکہ ہر وقت اس کو یاد رکھنا چاہیئے کیونکہ ہر شخص کو مرتے وقت لازمی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ خدائی قدرت کیا ہے؟

موت کے وقت ناتوانی۔

یہی انسان جو کسی وقت (۳۰) کیلو وزن تک بے کھٹکے اٹھا لیا کرتا تھا اور تقریر کرنے پر آتا تھا تو اس کی زبان ایک ایک گھنٹہ تقریر کرتے نہ تھکتی تھی لیکن جب موت سر پر منڈلاتی ہے اور چاہتا ہے کہ "لا الہ الا اللہ" زبان سے ادا کرے تو ناتوانی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ زبان اس کا ساتھ نہیں دیتی۔ جیسے اس کے سر پر کوئی بوجھ گر پڑا ہو بقول شاعر۔

آنان کہ بیک زبان دو صد سخن می گفتند
آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند
رو بگورستان دمے خاموش نشین
آن سخن گویان خاموش را ببین

یہ ہاتھ جو مظلوموں پر اٹھتے تھے اب یہ حال ہو جاتا ہے کہ منہ پر مکھی یا مچھر بیٹھ جائے تو ہاتھوں میں اتنی سکت بھی نہیں کہ اسے اڑا سکے۔ گویا ہاتھ اس کا کہنا نہیں مانتے اور زبان از کار رفتہ ہو چکی اور وہ پاؤں جو ارادہ کرتے ہی حرکت میں آجاتے تھے اب ساتھ نہیں دیتے۔ غرضیکہ کوئی عضو بدن اب اس کے حکم کے تابع نہیں رہا۔ وہ صرف آرزو کر کے رہ جاتا ہے کہ کوئی تو اس کا کہا مان لے لیکن کسی پر اس کو قدرت نہیں۔

مرتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ اس کو جو قدرت اور طاقت حاصل تھی وہ پرایا مال تھا اب بوقت مرگ یہ معلوم ہوا کہ یہ قدرت و طاقت خدا کی دی ہوئی تھی اور اب تک وہ جس زعم میں مبتلا تھا وہ محض خود فریبی اور دھوکہ تھا اس لئے انسان کو چاہیئے کہ مال و زر یا حکومت و سلطنت مل جائے تو غرور و تکبر سے کام نہ لے کیونکہ تخت سلطنت یا حکومت کی کرسی انسان کو بدبخت بنا دیتی ہے اور وہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کا اپنا ہے۔

بہلول کا قبرستان جانا اور وزیر کو نصیحت کرنا۔

خلیفہ ہارون الرشید کا وزیر ایک قبرستان سے گزر رہا تھا دیکھا کہ بہلول تنہا قبروں کے درمیان بیٹھا بوسیدہ ہڈیوں کو ادھر ادھر پھینک رہا ہے۔ وزیر نے پوچھا بہلول کیا کر رہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ چاہتا ہوں کہ مردوں کو الگ الگ کروں یعنی رئیسوں کو ان کی رعایا سے اور وزیروں کو ان کے ماتحت حاکموں سے علیحدہ کر دوں۔ ویسے تو ایک کا سر اور دوسرے کا سر ایک سے ہیں قبر میں پہنچ کر سب ایک ہو گئے ہیں۔

گویا ان الفاظ سے وزیر کو پند و نصیحت کرنا مقصود تھا۔

باب سوم

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ.

معارف نفس اور معرفت الہیٰ کی تطبیق

حضور اکرمؐ کی ایک مشہور حدیث ہے کہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ" انسان کی آنکھ تو خدا کے دیدار کی اہل نہیں اور چونکہ دیکھنے سے قاصر رہتی ہے اسلئے اسکے وجود ہی سے انکار کر دیتی ہے کیونکہ انسانی آنکھ جسم کے ساتھ مربوط ہے اور جسم کا حال یہ ہے کہ وہ کثیف بھی ہے اور اس کا سایہ بھی پڑتا ہے۔ گویا ہماری آنکھ انہی چیزوں کو دیکھ سکتی ہے جن کا سایہ ہو اور جسم رکھتی ہوں، اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ نہایت لطیف ہے لہذا اسکے دیدار پر وہ قادر نہیں۔

انسان اپنی ہستی کو بھی سمجھنے سے قاصر ہے۔

اس بیان کو پوری طرح عقل کی گرفت میں لانے کے لئے تم اپنے نفس پر غور کرو۔ کیا کوئی شخص خود اپنے نفس کے وجود سے انکار کر سکتا ہے۔ بجز اس کے کہ وہ مالیخولیا کا مریض ہو یا سوفسطائی خیالات کا حامل ہو حالانکہ عقل کا فیصلہ تو یہ ہے کہ نفس کا وجود ہے۔ لیکن کیا تم اس کو دیکھ سکتے ہو، تم تو صرف اپنے جسم ہی کو دیکھنے کے اہل ہو۔ اور تمہارا بدن یا جسم تو محض ایک سواری ہے۔ اور اس پر حکمرانی کرنے والا اور اس کا نظام چلانے والا جس کو کمال کی معرفت بھی ہے۔ جسم سے منزہ اور مجرد شے ہے اس کا جسم نہیں اور اسی لئے ان ظاہری آنکھوں سے اس کا مشاہدہ بھی ممکن نہیں۔ اس طرح اس نفس کی خالق جو ہستی ہے یعنی خدا تو اس کو بھی تم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔

آثار اور نشانیوں کے ذریعہ معرفت نفس حاصل ہو سکتی ہے۔

جس طرح نفس کی پہچان اس کے آثار اور نشانیوں سے ہوتی ہے اسی طرح خلاق عالم کی معرفت بھی اس کی صناعی اور اس کے کمال قدرت کے نمونوں کو دیکھکر ہی ممکن ہے۔ اس کی تخلیق کے جو آثار و شواہد کائنات میں ہر طرف پائے جاتے ہیں انہیں سے اس کے وجود کا پتہ چلتا ہے اور اس کا یقین ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

جسم انسانی کے اندر روح اور نفس کی کارفرمائی کا ثبوت ہماری حرکات و سکنات نطق و تکلم اور اسی طرح جسم کے دوسرے افعال و کارکردگی ہی کو دیکھکر حاصل ہوتا ہے کیونکہ اگر روح اور نفس موجود نہ ہو تو یہ جسم خاکی محض جامد ہستی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

خدائے بزرگ و برتر کی آیات اور نشانیاں تو پوری کائنات میں موجود ہیں اور سب اس کی ہستی اس کے علم اور اس کی قدرت و حکمت پر شاہد ہیں۔

نفس مجرد مکان کا محتاج نہیں۔

پس حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ" کی تشریح کے تعلق سے یہ بات ذہن نشین ہونی چاہئے کہ جسم تو مکان اور جگہ کا محتاج ہے اور اس کے اندر جس کا قبضہ ہے یعنی نفس وہ مکان اور جگہ سے بے نیاز ہے۔ خداوند عالم بھی مکان کا محتاج نہیں کیونکہ وہ لامکان ہے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ خدا کہاں ہے؟ عرش پر یا آسمان پر؟ اوپر یا نیچے؟ یہ سب کچھ محض ظن و گمان اور قیاس ہوگا۔ اگر ایسا خیال کریں۔ پس ثابت ہوا کہ جسم تو مکان کا محتاج ہے اور اس کا خالق مکان سے بے نیاز ہے۔ یعنی مجرد شے کو مکان کی حاجت نہیں ہوتی۔

امیرالمومنین کا ارشاد ہے کہ "اَيْنَ الْاَيْنُ فَلَا يُقَالُ لَهُ الْاَيْنُ" کیونکہ وہ تو مکان آفرین اور مکان کا خالق ہے اس لئے اس کے ساتھ مکان کوئی نسبت نہیں رکھتا اور مکان سے اسے دلچسپی نہیں۔ ارض و سما بھی اسی نے پیدا کیے ہیں لہذا آسمان و زمین کو اس کا مکان کس طرح کہہ سکتے ہیں؟۔ اسی نے عرش کی تخلیق کی ہے پس یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ عرش کو اپنا مکان بنائے ہوئے ہے

اپنی اس بات کا ثبوت کہ خدا لامکان ہے خود ہماری اپنی جانوں کے اندر موجود ہے ہماری جان اس کی شہادت بھی دے رہی ہے اور اس طرح ہمارے اپنے جسموں کے اندر جاری و ساری ہے۔ اب اگر کوئی پوچھے کہ تمہاری جان کہاں ہے؟ تو اس کا جواب ہے۔ سر سے پاؤں کی انگلیوں تک

جہاں بھی چاہو محسوس کر سکتے ہو کہ تمہاری جان یہیں ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے نیز یہ کہنا بھی غلط ہے کہ تمہاری جان جسم کے کسی حصہ میں بھی موجود نہیں کیونکہ یہ بے معنی بات ہوگی ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ بدن ہی روح ہے اور نہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ نفس یا روح بدن سے الگ کوئی چیز ہے۔

"یَامَنْ لَا یَحْوِیْهِ مَکَانٌ وَّلَا یَخْلُوْ مِنْهُ مَکَانٌ"

یعنی خدا وہ ہے جو مکان تو نہیں رکھتا لیکن کوئی جگہ ایسی نہیں جو اس سے خالی ہو اور وہاں وہ موجود نہ ہو۔

جان تو وہ ہے جو ہماری ذات اور جسم سے جدا نہیں۔

چنانچہ ہماری جان ہماری اپنی ذات سے الگ نہیں۔ وہ اپنی اصل میں مجرد تو ہے لیکن پورے بدن پر محیط ہے۔ بظاہر بھی اور بہ باطن بھی وہ سارے جسم کو اپنے تصرف میں لئے ہوئے اور ایسا نہیں کہ جسم کے کسی خاص مقام پر اس کا وجود ہو۔ وہ تو جسم کے ہر ہر حصہ کو اپنا مسکن بنائے ہوئے ہے اور اس میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ وہ مکان سے بے نیاز تو ہے لیکن ہر جگہ موجود ہے اس کا سایہ تک نہیں ہوتا پھر بھی جسم کا کوئی حصہ اس سے خالی نہیں۔

عضو بیجان تو مفلوج یا مردہ ہی ہوتا ہے۔

"اَلَآ اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ" اللہ ربّ العزّت ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے تاہم اس کے لئے مکان یا جگہ گھیرنے کا تصور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اپنی ہی جان پر غور کرو تو تم پر روشن ہو جائے گا۔ کہ وہ کسی مکان اور محل میں

مقید نہیں ۔ وہ تو تمہارے جسم میں سرتاپا موجود ہے اور اگر یہ بات نہ ہو تو تمہارا جسم یا تو مفلوج ہو جائے یا مردہ کیونکہ اس میں جان باقی نہ رہتی ۔ پس مکان یعنی بدن کا نام روح نہیں لیکن روح بدن سے جدا بھی نہیں ۔ کائنات کی کوئی شئے اور موجودات عالم میں سے کسی کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خدا وہیں ہے لیکن پھر بھی کوئی جگہ اور کوئی شے خدا کے وجود سے خالی نہیں ۔

تم جدھر بھی جاؤ وہاں خدا ہے ۔ تم جہاں بھی ہو خدا تمہارے ساتھ ہے

"وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ"

(سورہ حدید آیت ۴)

اب سوال یہ ہے کہ خدا کا کوئی مکان نہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہو، اس کی مثال ایسی ہے جیسے تمہاری جان تمہارے جسم کے اندر ہے ۔

نفس کی حقیقت سب سے پوشیدہ ہے ۔

پس متذکرہ بالا وجوہ کی بنا پر یہ ثابت ہو گیا کہ نفس انسانی کا صرف اس کے آثار اور کارفرمائیوں ہی سے پتہ چل سکتا ہے ورنہ اس کی حقیقت تک پہنچنا محال ہے اور آج تک کسی شخص کی رسائی اس کی حقیقت تک نہ ہو سکی ۔

"وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۔ قَلِيلًا" تک

(سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۵)

آخر آدمی کی جان ہے کیا؟ یہ کوئی نہیں جانتا اور نہ ہنوز نفس کی حقیقت سے کوئی باخبر ہو سکا ہے ۔ محض اس کی کارفرمائیوں سے اس کا علم ہو جاتا ہے کہ تمہارے بدن کے اندر اس کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا کچھ رونما ہوتا ہے؟ ۔

بالکل اسی طرح ذات الوہی کا علم بھی کسی کو نہیں ہو سکتا ۔ اے آدم خاکی جبکہ تو اپنی ہی ذات اور اپنے آپ کو پہچاننے کی قدرت نہیں رکھتا پھر کیسے چاہتا ہے کہ خدا کی ذات کی معرفت تجھ کو حاصل ہو اور اس کی حقیقت کا احاطہ کر سکے حتیٰ کہ مخلوقات الہٰی کی ایک مخلوق ملک الموت یعنی عزرائیلؑ ہی کے کام تک سے تو واقف نہیں ہو سکا کہ وہ کس طرح تیری روح قبض کرتا ہے وہ کس طرف سے آتا ہے اور کس طرف سے تیری جان نکالتا ہے؟۔

عزرائیلؑ کے لئے پورا کرہ ارض ایک دسترخوان کی مانند ہے۔

روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معراج کی رات عزرائیل سے دریافت فرمایا کہ تم ایک ہی وقت میں دو آدمیوں کی جان کیسے نکالتے ہو جبکہ ایک مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں۔

عزرائیل نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ طاقت بخشی ہے کہ پورا کرہ ارض میرے لئے ایک دسترخوان بنا دیا ہے اور آن واحد میں موجودات عالم کی روح قبض کرنے پر مجھے قادر کر دیا ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اسی کے مطابق ذات الہٰی کے بارے میں ظن وگمان بھی حرام ہے کیونکہ اس کا ادراک محال اور ناممکن ہے۔ اور ہمارے لئے سوائے حیرت کے چارہ نہیں۔ یہ مخلوقات کے حیطہ اختیار میں نہیں کہ وہ خالق کا احاطہ کر سکے ۔ اس کی قدرت اور کمالات اور اس کی مخلوقات کو دیکھکر یعنی اس کے وجود پر ایمان کے راستے کی جانب رہبری ہوتی ہے اور انسان کی طاقت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ اس کی ذات کے بارے میں غور وفکر کرنے لگے اور اس کی حقیقت تک رسائی کا خواہاں ہو۔

روح کی وحدت خدائے عزوجل کی وحدت پر دال ہے۔

وحدت اپنے فاعل کی وحدت پر دلالت کرتی ہے کہ اس پورے کارخانہ ہستی پر حکمرانی اور اس کا انتظام و انصرام ایک ہی مقتدر ذات کے قبضہ قدرت میں ہے ۔ لاکھوں مخلوقات کی تقدیر بدلنے میں اس کا ہاتھ ہوتا ہے ۔ پس اسی طرح روح بھی سینکڑوں کام انجام دیتی ہے لیکن وہ ایک ہی ہوتی ہے ۔ اور روح کی یہ وحدت اپنے اظہار کے تمام طریقوں سے اس جہاں ہستی میں خداوند قدوس کی وحدت ہی کا پتہ دیتی ہے اور کیا خوب پتہ دیتی ہے کہ اس کارخانہ عالم کے انتظام کو چلانے والی اور سارے امور کی مدبر کونسی ذات ہے چہ جائیکہ فرمایا "یُدَبِّرُ الْاَمْرَ" لہذا ہر چھوٹا اور بڑا کام جزوی ہو کہ کلی اسی کے قدرت میں ہے جس طرح تمہارا جسم کہ اسکا ایک ایک موئے بدن اور ایک ایک عضو تمہاری روح کے زیر فرمان ہے ۔ مثلاً تمہارے فلاں دانت میں درد ہے یا تمہارے پاؤں میں کوئی کانٹا چبھ جاتا ہے تو تمہیں فوری اس کا احساس ہو جاتا ہے اور تم اس دانت کے علاج کی تدبیر کرتے ہو یا اس کانٹے کو نکال باہر پھینکتے ہو۔

روح اپنے سینکڑوں وظائف کے باوجود ایک ہی ہے۔

جس طرح ایک ہی روح جسم انسانی کے مدبر کی حیثیت میں سینکڑوں کام انجام دیتی ہے اسی طرح موجودات عالم کا مدبر بھی اپنی بے انتہا قدرتوں اور کمالات کے ساتھ اپنی ذات میں یکتا ہے ۔ " لا الہ الا اللہ " . خلاصہ اس ساری گفتگو کا یہ ہوا کہ ہر آدمی کے نفس کی حقیقت سے شناسائی تو ممکن نہیں چہ جائیکہ ذات خداوندی کی حقیقت کا عرفان ہو سکے ۔ ہم صرف اس کی قدرت

اور کبریائی کے کمالات دیکھ کر ہی اس کے وجود اور اس کی وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں اور اشہد ان لا الہ الا اللہ کہتے ہیں گویا خدا کو ہم نہیں دیکھ سکتے صرف اس کے کاموں کو دیکھتے اور انہی کو دیکھکر اپنے اپنے علم و صلاحیت کے مطابق اس کی وحدانیت کی شہادت دیتے ہیں۔ اسی طرح جیسا کہ تم اپنی جان یا روح کو تو نہیں دیکھ سکتے تاہم اس کے کاموں پر تمہاری نظر ہوتی ہے۔

انسان کے جسم میں روح کے کام۔

روح کے افعال کی ایک قسم وہ ہے جو تمہارے جسم کے اندر رونما ہوتے ہیں اور ان افعال کی ایک دوسری قسم بھی ہے جنہیں وہ بدن کے واسطہ کے بغیر اور اس سے جدا رہ کر بھی انجام دیتی ہے۔

جن کاموں کا بدن سے تعلق ہے ان میں تمہارے حواس لامسہ، باصرہ، سامعہ، شامہ اور ذائقہ شامل ہیں۔ ہاضمہ کے نظام کا بھی اسی میں شمار ہوتا ہے جان نکل جائے اور چراغ روشن بجھ جائے تو پھر تمہاری آنکھیں بینائی سے محروم ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ تمہاری آنکھیں اور سر اپنی جگہ باقی رہتے ہیں۔ اسی طرح جسم سے جان نکل جائے تو تمہارے حواس جواب دیدیتے ہیں حالانکہ سارے اعضاء موجود رہتے ہیں۔

موت بھی روح کی کارکردگی کی اک نشانی ہے۔

جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی دیکھا کہ موت ہماری زندگی اور روح کی کارکردگی پر شاہد ہے۔ بدن کی یہ صلاحیت کہ سر اپنی جگہ تو موجود ہے لیکن تھوڑی دیر قبل ہی تمہاری آنکھیں دیکھ سکتی تھیں اب دیکھنے سے قاصر ہو جاتی

ہیں۔ تمہارے کان جو سننے کی طاقت رکھتے تھے اب اس کے اہل نہیں رہے۔ تو پتہ یہ چلا کہ دیکھنے یا سننے کی صلاحیت آنکھ اور کان کی اپنی نہ تھی۔

اسی طرح گویائی بھی زبان کی ذاتی صلاحیت نہیں جو زبان موت سے پہلے تھی وہی باقی ہے لیکن مرنے کے بعد وہ اپنی صلاحیت کھو دیتی ہے۔ کیونکہ گویائی تو تمہاری روح کے ساتھ قائم تھی۔

انسانی جسم کے اندر جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے وہ سب روح اور جان کے وجود پر شاہد ہے ہر چند کہ اس کی حقیقت ہم نہیں جانتے اور نہ اس بات کا عرفان ہمیں حاصل ہے کہ وہ وجود کے کس مرتبہ کی حاصل ہے۔ وہ جسم کے مقابلہ میں مجرد تو ہے لیکن یہ عجیب طرح کا وجود ہے گویا ایک چراغ ہے جس سے بدن کو روشنی ملتی رہتی ہے اور جسم کے سارے افعال و وظائف انجام پاتے ہیں لیکن جوں ہی وہ بدن سے جدا ہو جائے تو بھی بدن ایک پتھر اور کسی سوکھی لکڑی کے مابین فرق کرنے کے قابل بھی نہیں رہتا۔

بدن کے واسطہ کے بغیر روح کے افعال۔

اب تک جو کچھ ہم نے بیان کیا وہ ان افعال کے بارے میں تھا جنہیں روح بدن کے ذریعے سے انجام دیتی ہے۔ لیکن اس کی کارفرمائی کی ایک اور قسم وہ ہے جس میں بدن کے ساتھ تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں قوی دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں اور اب جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں وہ امام جعفر صادقؑ کے فرمودات سے استفادہ کا حاصل ہے کہ امام موصوف نے کس طرح استدلال کے ذریعہ روح کا مجرد ہونا ثابت کر کے اور ہندوستان کے ایک شخص کو قائل کر دیا تھا۔

مادہ پرست بزعم خود یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان محض گوشت و پوست

کا نام ہے درانحالیکہ الہیات کی رو سے یہ گوشت و پوست اور یہ بدن روح کے وسائل ہیں جن سے وہ کام لیتی ہے۔

خواب کے دوران روح کے کام۔

امام جعفر صادقؑ نے اس ہندی نقاد کے سامنے چند مثالیں بیان فرمائی تھیں جن میں سے ایک یہ ہے۔

کیا کبھی تو نے دیکھا کہ خواب میں تم رو رہے ہو یا ہنس رہے ہو۔

اس نے جواب دیا۔ ہاں اکثر ایسا ہوتا ہے۔

پھر آپ نے پوچھا۔

خواب میں کبھی خوبصورت یا خوفناک چہرے دیکھے ہیں؟

اس نے وہی جواب دیا کہ بکثرت۔

آپ نے دریافت کیا۔

کیا خواب میں تم نے کبھی لذیز غذا کھائی ہے؟ جس کی خوشبو تم نے زندگی بھر نہیں سونگھی تھی؟

اسکا جواب وہی تھا کہ جی ہاں بسا اوقات ایسا ہوا ہے۔

امام موصوف نے فرمایا کہ بہت خوب۔ لیکن کبھی تم نے اس پر غور کیا کہ وہ کون ہے جو روتا ہے یا ہنستا ہے؟ اور خوبصورت یا خوفناک صورتیں کس کو دکھائی دیتی ہیں جن سے تم مسرور یا محزون ہوتے ہو؟ یا وہ کس کی شخصیت ہے جو لذت بخش غذاؤں سے لطف اندوز ہوتی ہے؟ کیا یہ تمہارا جسم ہے جس کا ایک ٹکڑا الگ ہو کر آنکھ یا زبان یا منہ بن جاتا ہے؟

احتلام روح کے عمل کی ایک اور مثال ہے۔

اس ہندی نقاد نے یہ سب سن کر ایک طفلانہ بات کہدی کہ خواب تو پریشان خیالی کا نتیجہ ہوتا ہے اور سراب سے بڑھکر اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ آدمی جب بیدار ہو جاتا ہے تو جو کچھ اس نے دیکھا ہے اس کے اثرات باقی نہیں رہتے۔

امامؑ نے جواب دیا۔

کیا تم نے کبھی خواب میں دیکھا کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے؟ اس نے جواب دیا۔ جی ہاں۔ آپ نے فرمایا تو پھر بیدار ہونے کے بعد تم نے احتلام کے اثرات نہیں دیکھے؟ آپ نے پوچھا کہ پھر ایسا کیوں ہوتا ہے؟

آپ نے اس کو سمجھانے کے لئے فرمایا۔

آدمی کی ذات کے اندر حواس کے توسط سے جو کچھ پیش آتا ہے روح کے اندر بھی وہ سب کچھ واقع ہو سکتا ہے۔ عالم بیداری میں جس طرح تمہاری بینائی سماعت اور گویائی کے افعال میں روح کا عمل دخل ہوتا ہے ان ہی کا نمونہ وہ تمہیں خواب میں بھی دکھا سکتی ہے اور مکاشفات میں بھی۔

رویائے صادقہ روح کی قدرت کا عجیب نمونہ ہیں۔

روح آئندہ پیش آنے والے واقعات کا بھی مشاہدہ کر سکتی ہے یعنی اگر ایک سال بعد کوئی واقعہ پیش آنے والا ہو تو روح اس کے مشاہدہ پر قادر ہے اور خواب میں اس کا ادراک ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح ہی تقدیر ہے جو لوح محفوظ میں موجود ہے اور روح ہی اس کا ادراک کر رہی ہے۔

تم خواب میں بہت ساری ایسی باتوں کا مشاہدہ کرتے ہو کہ اس مادی دنیا سے انکا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مادہ میں شعور تو ہوتا نہیں اور ہزاروں ایٹم بھی یکجا جمع ہو جائیں تب بھی ان میں شعور کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ شعور مادہ کی چیز ہی نہیں۔ ہاں انسان کی روح ایسی باتوں کو سمجھنے پر قادر ہے جن کا مادہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس دعوے کی تصدیق ہزاروں طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ کم ہی ایسے لوگ ہونگے جو عالم رویا کی باتوں کا مفہوم سمجھ سکیں جن سے نفس اور روح کے مجرد ہونے کا ثبوت مہیا ہوتا ہو۔ ایسے شواہد بے شمار ہیں اور ان سب کا احاطہ یہاں ممکن نہیں۔ تاہم اس شعر کے مصداق کہ۔

آب دریا را اگر نتواں کشید
ہم بقدر تشنگی باید چشید

ایک حکایت نمونہ کے طور پر یہاں بیان کرتا ہوں تاکہ میرا مطلب واضح ہو جائے یعنی یہ کہ روح مادہ سے ماورا کسی اور عالم کی شئے ہے اور وہیں سے وہ بہت سی چیزوں کا ادراک بھی کر سکتی ہے۔

نادر شاہ کے عجیب خواب

ایران کے قبیلہ افشار کے نادر شاہ کے بارے میں کتب تواریخ میں قصہ درج ہے کہ جب وہ اپنی آخر عمر کو پہنچا تو اس کی نیند غائب ہو گئی۔ راتوں کو وہ باہر نکل کر چہل قدمی کرتا اور بستر پر لوٹ آتا لیکن نیند آنے کا نام نہ لیتی۔ عمر کے اس حصہ میں وہ خاصا بد مزاج بھی ہو گیا تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اس

سے دریافت کر سکے کہ وہ رات بھر کیوں نہیں سویا۔ صرف حسن علی معین الممالک نامی ایک سردار تھا جو نادر شاہ کا خاص الخاص مصاحب تھا نادر شاہ اپنے اسرار و رموز اس کے سامنے بیان کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک رات جرات و ہمت سے کام لیکر نادر شاہ سے پوچھ ہی لیا کہ آخر آپ کو ایسی کونسی فکر لاحق ہوئی تھی کہ رات آپ نے آرام نہیں کیا۔

نادر شاہ نے جواب میں کہا کہ میں تم کو بتائے دیتا ہوں لیکن اس تاکید کے ساتھ کہ تم اس کا کسی اور سے ذکر نہ کرو گے۔ پھر کہنے لگا کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے عروج اور میری سلطنت کے قیام و استحکام سے قبل ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ دو ملازم بڑی عزت و احترام سے مجھے ایک محل میں لے گئے وہاں بارہ امام تشریف فرما تھے جن کے نور سے سارا محل منور ہو رہا تھا۔ ان بزرگوں کے آقا میرے قریب تشریف لائے اور فرمایا کہ ہم تمہارے لئے ایک تلوار لائے ہیں اور اس تلوار کو انہوں نے میری کمر سے باندھ دیا پھر ارشاد فرمایا کہ ہم تمہیں ایران کی اصلاح کے لئے روانہ کر رہے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور خوش اخلاقی سے پیش آؤ۔

دوسرے ہی دن سے میں نے حکم کی تعمیل میں اپنی تیاری شروع کر دی یہاں تک کہ ایران کی سلطنت تک میری رسائی ہو گئی اور میں نے ہندوستان بھی فتح کر لیا اور اس کے علاوہ بھی متعدد فتوحات میرے نصیب میں آئیں اور میں نے ملک کے نظم و نسق کی اصلاح اور اس کے استحکام کی طرف توجہ کی۔

(لیکن آخر کار اس کا رویہ اور چال چلن انتہائی نازیبا ہو گیا۔ قتل و غارت گری اس کا شعار بن گیا اور اس نے بے شمار بے گناہوں کا خون اپنی

گردن پر لے لیا)

شمشیر چھین لی گئی۔

نادر شاہ اپنی افتاد بیان کرتے ہوئے کہنے لگا کہ آج رات پھر میں نے ایک خواب دیکھا وہی خدام جو پہلے بڑی محبت و احترام سے مجھے لے گئے تھے اب ہنایت ہی بے دردی سے میری پٹائی کر رہے تھے اور اسی حالت میں گھسیٹتے ہوئے مجھے انہی آقاؤں کے روبرو پیش کر دیا جنہوں نے میری کمر سے تلوار آویزاں کی تھی ۔ جب مجھے انکی خدمت میں حاضر کر دیا گیا تو انہوں نے اس مرتبہ بڑی درشتی اور تند کلامی سے کام لیتے ہوئے فرمایا کہ کیا تیرے لئے یہ زیب دیتا ہے کہ مسلمانوں سے اس طرح کا سلوک کرے جیسا کہ تو نے کیا ہے ؛ وہ تلوار اب ہمارے حوالے کر دو ۔ یہ کہکر انہوں نے میری کمر سے تلوار کھول لی اور مجھے دھکے دیکر وہاں سے نکلوا دیا۔

غرضیکہ اسی خواب کی بدولت میں اس وحشت میں مبتلا ہو گیا ہوں ۔ کہتے ہیں کہ دوسرے دن اسے قتل کر دیا گیا اور جس محل کو اس نے اپنی رہائش کے لئے آراستہ کیا تھا اس کی لاش وہیں پہنچائی گئی ۔ بقول شاعر

سر شب سر قتل و تاراج داشت
سحر گہ نہ تن سر نہ سر تاج داشت

یہ اس کی انتہائی بدبختی تھی کہ جنہوں نے اسے اتنی رفعت و بلندی عطا کی تھی انہی کے ہاتھوں اسے ذلت و خواری کا منہ دیکھنا پڑا ۔ اس خواب

سے بہتر نفس کے مجرد ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟

نعمت اور عقوبت ہر شخص کے اپنے اعمال کے ساتھ وابستہ ہے۔

کسی کو مال و دولت اور جاہ و سلطنت سے نوازا گیا ہے تو اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس میں کوئی خوبی یا اس کی اہلیت ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ جاہ و سلطنت محض آزمائش ہے۔ چنانچہ یہ سب کچھ مل جانے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کے لئے وہ نعمت ثابت ہوتا ہے یا عقوبت کا باعث بن جاتا ہے۔ اگر اس سلطنت، اس جاہ و جلال اور مال و دولت کے بعد وہ عدل و احسان سے کام لے تو اس کے لئے نعمت ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف عمل کرے گا تو یہ سب کچھ اس کے لئے بلائے بے درماں اور زحمت کا باعث بن جائے گا۔

پس کسی پر انعام و اکرام کی بارش ہو تو اس کے گناہوں میں مزید اضافہ کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اس کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ کیونکہ امتحان و آزمائش مرحلہ وار ہوتا ہے۔

مال و دولت اور اقتدار و حکومت امتحان و آزمائش کا ذریعہ ہیں۔

چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا کہ یہ خیال نہ کرو کہ کسی کافر کو ہم اگر مہلت دیتے ہیں تو یہ اسکے لئے نفع بخش ہے بلکہ ہم اس لئے مہلت دیتے ہیں کہ وہ اور زیادہ گناہوں کا ارتکاب کرے اور ہمارے عذاب کا زیادہ سزاوار بن جائے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

(آل عمران آیت ۱۷۸)

ہم کسی کو مال وزر اور جاہ واقتدار اس لئے دیتے ہیں کہ اس کا امتحان اور اسکی آزمائش مقصود ہوتی ہے تاکہ اس کی شقاوت یا سعادت ظاہر ہو جائے۔

اس حکایت کے بیان کرنے سے ہماری غرض وغایت یہ تھی کہ یہ بتایا جائے کہ گوشت و پوست کو اس قسم کی باتوں سے کیا کام اور یہ کہ بدن یا جسم ان کا مطلب کس طرح سمجھ سکتا ہے؟ نادر شاہ کی سلطنت تو ولی کے حکم کے ساتھ وابستہ تھی۔ اگر امام نہ چاہتے تو ایسا نہ ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ اس قسم کی خبروں کا تعلق نفس سے ہے نہ کہ بدن سے۔

علیؑ خواب میں ایک ناصبی کا سر تن سے جدا کر دیتے ہیں۔

اب ہم یہاں علیؑ کا ایک معجزہ بیان کریں گے۔ قطب راوندی نے ایک راوی کے حوالے سے روایت ہے کہ اس نے موصل سے مکہ معظمہ جانے کا ارادہ کیا تو احمد بن تمدون کے گھر گیا جو موصل کا امیر کبیر اور اعیان واشراف میں سے تھا لیکن علیؑ کا سخت دشمن تھا۔ وہ کہتا ہے کہ چونکہ وہ اس کا ہمسایہ تھا اس لئے حق ہمسائیگی کا لحاظ کرتے ہوئے اس کو خدا حافظ کہنے کے لئے گیا تھا اور اس سے دریافت کیا کہ اس کی کوئی خواہش یا فرمائش ہو تو بیان کرے تاکہ اس کو پورا کر دے۔ یہ سن کر احمد بن تمدون اندر گیا اور قرآن مجید لاکر اس سے مخاطب ہوا کہ۔

"تم اس قرآن کی قسم کھا کر وعدہ کرو کہ جو میں کہونگا اس پر عمل کروگے"۔
اس نے جواب دیا کہ اگر اس کے بس میں ہوا تو ضرور کرے گا۔
احمد بن حمدون نے کہا کہ

"روضہ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جب حاضری دو تو سرہانے کھڑے ہو کر عرض کرنا کہ "یہ کیسا قحط الرجال تھا کہ فاطمہ علیہا السلام کو حضرت علی علیہ السلام کی زوجیت میں دے دیا جن کے سر پر بال تک نہیں اور جن کا پیٹ باہر کی طرف نکلا ہوا تھا وغیرہ۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟

راوی کہتا ہے کہ میں نے تو یہ پیغام بھلا دیا تھا لیکن آخری دن مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں یکا یک مجھے یاد آگیا اور میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ میں شرمندہ ہوں لیکن اس نے مجھے قسم دے رکھی ہے اس لئے عرض کر رہا ہوں۔

اسی رات میں نے علی علیہ السلام کو خواب میں دیکھا کہ آپ راوی کو اپنے ہمراہ لیکر موصل میں احمد بن حمدون کے گھر پہنچے۔ احمد سو رہا تھا۔ آپ نے اس کا لحاف اس کے اوپر سے ہٹا دیا اور ایک خنجر سے جو آپ کے ہاتھ میں تھا اس کا گلا کاٹ دیا اور اس کا منحوس سر تن سے جدا کر دیا۔ پھر لحاف سے خنجر کا خون صاف کیا جس سے لحاف پر خون کی سرخ رنگ کی دھاری سی بن گئی پھر دست مبارک سے مکان کی چھت کو اٹھا کر دیوار کے ایک گوشہ میں خون آلود خنجر کو رکھ دیا۔

راوی آگے چل کر کہتا ہے کہ میں اس وحشتناک خواب سے گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور اپنے ساتھیوں سے خواب کی پوری سرگزشت بیان کر دی کہ میں نے ایسا وحشتناک خواب دیکھا ہے اور اس دن جو تاریخ تھی وہ بھی میں نے نوٹ

نہ لی۔

پھر جب وہ موصل واپس ہوا تو معلوم ہوا کہ یقیناً فلاں رات اس کا قتل اسی طرح واقع ہوا تھا لیکن اس کے قاتل کا پتہ نہ چل سکا کہ کون تھا چور تو نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی اور کوئی چیز چوری بھی نہیں ہوئی۔ سب کے لئے حیرانی کا باعث تھی۔ موصل کی حکومت نے سارے ہمسائیوں کو تفتیش کے لئے نظر بند کر رکھا ہے تاکہ قاتل کا پتہ معلوم ہو لیکن ہنوز اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ راوی بیان کرتا ہے کہ میں نے اپنے ہم سفر ساتھیوں سے کہا کہ چلو حاکم موصل کے پاس جاتے ہیں تاکہ ان مظلوم بیچاروں کو قید سے رہائی دلادیں۔ چنانچہ ہم سب لوگ حاکم کے ہاں پہنچے اور میں نے سارا واقعہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ میرے ہم سفر ساتھی اس کے گواہ ہیں کہ میں نے اس طرح کا خواب دیکھا تھا اور اس دن کی تاریخ بھی یادداشت کے طور پر لکھ لی تھی۔ اس شخص کا قتل اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کے دو ثبوت موجود ہیں۔ ایک تو خونیں خنجر جو چھت کے فلاں حصہ میں رکھا ہوا ہے اور دوسرا وہ لحاف جو دو جگہ پر خون سے آلودہ ہے۔

حاکم نے یہ سارا قصہ سنا اور خود اس کی تصدیق کے لئے اس مکان پر پہنچا۔ اس نے دونوں نشانیاں دیکھیں تو سارے قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا۔ اس واقعہ کے بعد دشمن بھی شیعہ ہوگئے اور سارے ناصبی اپنے مسلک کو چھوڑ کر علی علیہ السلام کے موالیوں میں شامل ہوگئے۔

بے شعور مادہ کو ادراک مجرد سے کیا واسطہ؟-

غرضیکہ انسان خواب میں جو کچھ دیکھتا ہے بعد میں ویسا ہی واقعہ ہو جاتا ہے تو یہ روح کی کارفرمائی ہے - بدن کو جو گوشت و پوست کا بنا ہوا ہے اس طرح کے ادراکات سے کیا واسطہ - کیونکہ بدن تو مادی ہے اور مادہ بے شعور لہذا اس میں یہ تاب کہاں کہ آنے والے واقعات کا مشاہدہ کر سکے اور انہیں سمجھ سکے -

حاجی نوری مرحوم نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا موضوع رویائے صادقہ ہے - اس میں ایسے خوابوں کا بھی ذکر ہے جن کی حیثیت روح کے بدن سے جدا ہونے کے بعد روح کی کارفرمائی سے ہے - کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ مستقبل کے واقعات جنہیں ملائکہ اور عالم ملکوت ہی کو خبر ہو سکتی ہے روح جزوی یا کلی طور پر اس کا ادراک کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے -

اپنی خودی اور ذات کو پانے کی فکر کرو -

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنی خودی اور ذات کی فکر کرے اور اپنی روح کو پانے کے لئے کوشاں رہے - یہ بات جو زبان زد عوام ہے بڑی معنویت کی حامل ہے کہ "بخودت برس" یعنی اپنے آپ تک یا اپنی خودی تک پہنچو - لیکن بہت سے لوگوں کو اس کے اصل مفہوم تک رسائی نہیں ہوتی وہ بخیال خویش بدن تک پہنچنے کی فکر میں رہتے ہیں اس لئے کہ حیوان جو ٹھہرے -

"بخودت برس" کا مطلب ہے اپنی ذات اپنی خودی اور اپنی حقیقت تک رسائی حاصل کرنا - کیونکہ تیری شخصیت اور تیرا وجود محض بدن اور گوشت پوست کا نام نہیں - لہذا اپنے آپ کو پانے کی فکر کر تاکہ کل کو اولیاء اللہ کے ہاں پہنچنے کا راستہ مل جائے ورنہ خواہ اپنے بدن کو کتنی ہی زرق برق

پوشاک میں ملبوس کرے تیری ذات اور خودی اگر بد ہے، تو بد ہی رہے گی۔
پھر اس کا کیا حاصل؟

فرشتہ صفت بننے کی کوشش کرو۔

کسی عورت کی مجال ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کے آگے زبان بھی کھول سکے۔ حضرت زہراؑ کی نگاہیں تو باطن تک پہنچ جاتی ہیں۔ اگر ایک نظر ڈالدیں تو وہ وحشی جانور بن کر رہ جائے۔ بعض لوگ جب اپنے کپڑے اتار دیتے ہیں تو ان کے جسم انتہائی بدوضع اور خوفناک دکھائی دیتے ہیں اور انکے بدن سے انتہائی بدبو آتی ہے حالانکہ وہ اس کی آرائش و زیبائش کے لئے سو جتن کرتے اور سینکڑوں قسم کی عطریات اور خوشبو جسم پر مل لیا کرتے ہیں۔ لیکن بے فائدہ۔

کہتے ہیں کہ جب کوئی جھوٹا آدمی بات کرتا ہے تو اس کے منہ سے اس قدر گندی بو آتی ہے کہ عرش معلیٰ اور ملائکہ تک کو اس سے اذیت پہنچتی ہے اور سب اس پر لعنت کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا بدن تو معطر رہتا ہے لیکن یہ بدبو جو خارج ہو رہی ہے اس میں اس کی ذات کو دخل ہوتا ہے۔ چونکہ وہ بد ہے لہذا اس سے بدبو ہی نکلے گی۔

"یَامَنْ اَظْهَرَ الْجَمِیْلَ وَسَتَرَ الْقَبِیْحَ اَسْئَلُکَ یَااَللّٰهُ اَنْ لَّاتُشَوِّهَ خَلْقِیْ بِالنَّارِ"

اے خدا۔ تو خوبیوں اور نیکیوں کا آشکار کرنے والا اور برائیوں کی پردہ

پوشی کرنے والا ہے اس چہرہ کو آگ میں نہ جلا۔

مبادا آتشیں لباس پہنا دیا جائے۔

پس اس جمال حقیقی تک رسائی حاصل کریں۔ یعنی وہ جمال جس کی اصل ذات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ چاند اور سورج میں روشنی نہیں رہ سکتی اگر نور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منور نہ ہوں۔ لیکن یہ جمال روحانی ہے لہذا اپنے آپ پر ظلم نہ کرو اور اپنی روح سے غافل نہ ہو جا۔

تم اپنے جسم کے آرام و آسائش کے تو اتنے سامان کرتے ہو۔ اپنی قبر کے لئے بھی کوئی زادراہ مہیا کر لو۔ عالم برزخ میں تمہارا یہ بدن نہیں بلکہ تمہاری روح ہوگی اور وہاں اسے رزق بھی درکار ہوگا۔ لباس بھی۔ حیف تم پر کہیں آگ تمہارا لباس نہ بن جائے۔

"سَرَابِيلُهُمْ مِّن قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوهَهُمُ النَّارُ"

(سورہ ابراہیم۔ آیت ۵۰)

پھر تم دیکھو گے کہ یہ ظالم کس طرح ہر طرف سے تمہیں گھیر لے گی اور تم اس آگ کی گرفت سے بچ نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہو گے لیکن وہ اس طرح تمہارا احاطہ کر لے گی کہ نکل نہ پاؤ گے۔

"اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا۔

بیٹھو پس اپنی خودی تک رسائی حاصل کرو یعنی روح اور اپنی جان تک نہ کہ بدن تک۔

ارشاد باری ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ. أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ. لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ. أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ.

(سورہ الحشر۔ آیت ۱۹، ۲۰)

باب چہارم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یَآ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۔ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ ۔ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۔
(سورۂ الفجر۔ آیت ۲۷ تا ۳۰)

نفس مطمئنہ خدا کو محبوب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جن جن باتوں کا وعدہ فرمایا ہے اہل ایمان کو چاہئے کہ ان کے ما لہ و ما علیہ پر غور و فکر کر کے انہیں اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نادانی میں وہ تکبر کا شکار ہو جائیں اور ان باتوں کے اصل مفہوم تک ان کی رسائی نہ ہونے پائے نیز جس مقصد کا حصول مطلوب ہے اس سے قاصر نہ رہیں۔

انہی باتوں کے منجملہ نفس مطمئنہ کا مقام اور اسکی حقیقت سے واقفیت ہے جس کو اللہ رب العزت نے سورہ فجر کی آخری آیات میں بیان فرمایا ہے اور اسے ایمان کے بلند درجات میں شمار کیا ہے نیز صاف صاف لفظوں میں یہ وعدہ بھی فرمایا ہے کہ نفس مطمئنہ کا جو بھی حامل ہوگا مرتے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو رحمت کی خوشخبری دی جائے گی کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف اس حال میں لوٹ رہا ہے جو خداوند قدوس کو محبوب ہے اور

اپنی جنت میں داخل ہونے کا مژدہ سناتے ہوئے یہ اعلان فرمارہا ہے کہ وہ رضا و تسلیم کے ایسے مقام پر فائز ہے جہاں اس کی نہ کوئی پکڑ ہوگی اور نہ کوئی پابندی۔

آج کی زحمت کل کی رحمت۔

پس مرنے کے وقت سے لیکر بہشت میں داخل ہونے تک اس کے لئے سعادت ہی سعادت ہے۔ جیسا کہ ہم دعا مانگا کرتے ہیں کہ بارالٰہا ہماری موت کو ہمارے لئے باعث سعادت ورحمت بنادے۔ تاہم بعض لوگ اس دعا کی حقیقت جانتے ہیں اور نہ اس سے مانوس ہیں۔ حالانکہ " نابردہ رنج گنج میسر نشود" یعنی رنج وتکلیف کے بغیر گنج وراحت میسر نہیں ہوتی۔

قرآن مجید میں مقامات عالیہ تک رسائی کو جن میں سکون وآرام کی موت بھی شامل ہے انسان کی اپنی کوشش کا حاصل قرار دیا ہے کہ جب تک کوشش نہ کروگے منزل مراد نہ پاسکوگے۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۔ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۔

(سورہ النجم۔ آیت ۳۹، ۴۰)

اس قسم کی باتوں کا قرآن مجید میں جا بجا ذکر آیا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو وہ اپنے اعمال کے ذریعہ اس دنیا میں کمائے گا خواہ نیک عمل کرے خواہ بد اعمال میں مبتلا رہے۔ نیک عمل کے ذریعہ کمائی کی ہے تو آخرت میں نفع کا باعث ہوگا اگر برے اعمال کئے ہونگے تو اس کا نقصان بھی اسی کو برداشت کرنا پڑے گا۔

"لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ"

(سورہ بقرہ - آیت ۲۸۶)

پس خدا کی بندگی اور عبودیت میں زحمت اور ریاضت کے بغیر نفس مطمئنہ تک کسی بندہ کی رسائی ممکن نہیں اور موت بھی اس کو سکون و اطمینان کی نصیب نہ ہوگی۔

جوار آل محمد اور بہشت خاص۔

يَا اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ. اے بندے اگر تیرا نفس مطمئن ہے تو ارْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ یعنی اپنے رب کی طرف لوٹ جا۔ اور فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ یعنی میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا۔ اور جوار محمد و آل محمد میں شامل ہو جا۔ کیونکہ آل محمد خدا کے مقرب بندوں میں ہیں۔ اور موت کے وقت جس شخص کو ان ارواح عالیہ سے اتصال کی سعادت نصیب ہو وہ گویا نفس مطمئنہ سے سرفراز ہو گیا۔ اور طمانیت قلب کے مقام پر فائز ہو چکا اس طرح کہ موت کے بعد وہ کسی فصل یا کسی حجاب اور مزاحمت کے بغیر آل محمد کے زمرہ میں شامل ہو کر سیدھے بہشت خاص میں پہنچ جائے گا جیسا کہ ارشاد ہوا۔ "وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ" اور اگر چاہے کہ نفس مطمئنہ کے بغیر وہاں تک رسائی حاصل ہو جائے تو یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

بندہ کو چاہیئے کہ غرور کرنا چھوڑ دے اور بندگی کی کوشش زیادہ کرے۔

آخرت بڑا ہی کٹھن مرحلہ ہے۔ اگر دنیوی زندگی میں بندگی کے لئے

زحمت نہ اٹھائی ہو اور عمل نیک نہ کیا ہو تو اس مرحلہ کو عبور کرنا محال ہو گا۔ لہذا اس کٹھن وقت کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا ضروری ہے۔

سطور بالا میں ہم نے نفس مطمئنہ کے بارے میں جو کچھ بیان کیا اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غرور و تکبر سے نجات کا بھی راستہ ہے۔ آدمی اپنی غفلت اور بے خبری کے نتیجہ میں غرور و تکبر کا شکار ہو جاتا ہے اور فریب میں مبتلا رہتا ہے۔ لہذا اس تمام گفتگو کی غرض و غایت یہ ہے کہ اول تو ہم غرور و تکبر سے چھٹکارا پالیں اور دوسرے یہ کہ ہمیشہ اس بات کے لئے کوشاں رہیں کہ نفس مطمئن سے قریب تر ہو جائیں اور بالاخر اس تک رسائی حاصل کریں

انسانوں کے تین گروہ۔

بحیثیت مجموعی بنی نوع انسان تین گروہوں پر مشتمل ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو کفر و عصیان سے مرکب اور حب دنیا اور خواہشات نفسانی کا بندہ ہو۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو بندگی ریاضت اور پاکبازی کو اپنا شعار بنائے ہوئے اس پر ثابت قدمی سے جما رہے جس کے پائے ثبات میں کوئی تزلزل نہیں ہوتا اور اس کی نظر ہمیشہ سیدھے راستہ پر ہوتی ہے۔

ایک اور گروہ ان دونوں گروہوں کے بین بین ہوتا ہے کبھی اس طرف اور کبھی اس طرف۔ کبھی تو وہ رحمن کا بندہ ہے اور کبھی ہوا و ہوس اور شیطان کا۔ مسجد میں جب تک ہے رحمن کا بندہ بنا رہتا ہے لیکن گھر میں پہنچتے ہی یا بازار میں نکلتے ہی شیطان کا بندہ بن جاتا ہے۔

مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ۔

(سورہ نساء۔ آیت ۱۴۳)

گویا تذبذب کے عالم میں کفر اور ایمان کے مابین ڈولتا رہتا ہے پندو موعظت پر کان بھی دھرتا ہے اور اپنے اعمال بد پر پشیمان بھی ہوتا ہے تاہم دوبارہ اس پر غفلت طاری ہو جاتی ہے اور بندگی و عبودیت کے راستے سے منحرف اور طمانیت قلب اور کردار کی مضبوطی سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ تینوں گروہ جن کا میں نے ذکر کیا ہے خود قرآن مجید میں ان کا بیان موجود ہے۔

"وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً"

(سورہ واقعہ۔ آیت ۷)

پہلی جماعت جو کفر پر ڈٹی رہتی ہے اور نفس امارہ کے مکمل قابو میں ہوتی ہے ان کے بھی کئی درجے ہوتے ہیں اور آخری درجہ کامل گمراہی کا ہے۔ جہاں نور کا نام و نشان نہیں ہوتا۔

نفس امارہ خدا کا منکر ہوتا ہے۔

نفس امارہ کی بے حیائی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ اپنے آپ ہی کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے اور خدا سے انکار کر بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اے نفس تیرا وجود تو ہے لیکن تیرا خالق کوئی نہیں وہ بزعم خود یوں استدلال کرتا ہے کہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر کس طرح اس پر یقین کرلوں؟

سوال یہ ہے کہ کیا اس نے اپنے نفس کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اس پر یقین رکھتا ہے پھر خدا سے انکار کیسے؟ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ نفس امارہ کی پیروی نے اسے اس راہ پر لگا دیا ہے۔

نفس کی امارگی انسان کو رفتہ رفتہ اتنی پستی میں گرا دیتی ہے کہ اپنی زندگی اور اپنے وجود کو ابدی اور جاودانی خیال کرنے لگتا ہے اور اسے گمان تک

نہیں ہونے پاتا کہ وہ خود کوئی چیز نہیں ہے بلکہ وہ ہر چیز میں اپنی انا کی تسکین چاہتا ہے ۔ میرا کمال، میرا علم غرض کہ میں، میں کی رٹ لگائے رہتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خدا سے انکار کر کے اس دنیوی زندگی کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے ۔ قرآن مجید میں اس قسم کے لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ ۔

"وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیٰوتُنَا الدُّنْیَا" ۔

(سورہ جاثیہ ۔ آیت ۲۴)

وہ لوگ اس دنیا کی زندگی پر یقین نہیں کرتے ۔ چاہتے ہیں کہ بس اسی زندگی کی حفاظت کرتے رہیں اور اسی کے لئے سامان و اسباب اکٹھا کرتے رہتے ہیں ۔

مادی اور دنیوی زندگی کی فکر ۔

ایسے آدمیوں کو ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ ان کی دنیوی زندگی عیش و آرام میں گزر جائے اور ایک لمحہ کے لئے بھی انہیں یہ خیال نہیں آتا کہ وہ بندے ہیں ۔ ان کا کوئی خالق بھی ہے جو حی و قیوم ہے ۔ یہاں تک کہ اپنی ابتداء اور اپنی انتہا کے بارے میں بھی شک و شبہ میں پڑے رہتے ہیں لیکن اپنی قوت حافظہ اور تخیل کے بارے میں انہیں ذرا بھی شک و شبہ نہیں رہتا درآں حالیکہ نہ وہ حافظہ کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ قوت واہمہ کو ۔ پھر بھی انہیں ان کی موجودگی کا یقین ہوتا ہے کہ حافظہ اور شعور کا وجود ہے ۔ کوئی ان سے پوچھے کہ حافظہ اور شعور کس جگہ ہے اگر اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ نہیں سکتے تو ان کا بھی وجود نہیں ؛

تم دیکھتے اور سنتے ہو کیا تمہارا خدا دیکھتا اور سنتا نہیں ؟

سب سے بدیہی بات وجود باری تعالیٰ ہے۔ پھر کیسی عجیب بات ہے کہ تم خود تو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہو اور تمہارا خدا دیکھ نہیں سکتا؟ تمہاری تو آنکھ ہے لیکن تمہارا خالق دیکھنے پر قادر نہیں؟ کیا تم نے اپنی آنکھ کا قبلہ درست کر لیا؟ نہیں پس جس نے تمہاری آنکھ میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے وہ تو بغیر آنکھ کے بھی دیکھ سکتا ہے۔ اور کسی آلہ بصارت کی اس کو حاجت نہیں اس لئے کہ وہ تو ہر طرف سے تمہارا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اسی طرح تم اپنے کانوں سے سنتے ہو۔ لہذا تمہارا خالق تم سے بہتر قوت و سننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سورہ الملک میں کس لطیف پیرایہ میں ارشاد ہوا ہے۔

"اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ "۔

(سورہ الملک ۔ آیت ۱۴)

کہ "جس نے پیدا کیا ہے کیا وہ جانتا نہیں؟" لیکن نفس امارہ شاید اس کا مفہوم نہیں سمجھتا۔

نفس امارہ کو بندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔

نفس امارہ کے سارے کام وہ ہوتے ہیں جن میں حق سے روگردانی کا عنصر غالب ہوتا ہے اور مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ اپنے وجود کو برقرار رکھے لہذا اسے بندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

اب اس نفس امارہ کے بھی مدارج ہیں۔ بعض لوگ وہ ہیں جو دن کے

(۲۴ گھنٹے) اسی نفس کے زیر فرمان ہوتے ہیں اور ساری عمر اسی حالت میں گزار دیتے ہیں۔ نفس امارہ ان پر اس قدر غلبہ پا لیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو آقا اور مالک سمجھنے لگتے ہیں اور انہیں بندگی کا خیال تک نہیں آتا۔

کم و بیش سب کا یہی حال ہے۔ لیکن حقیقت سے آنکھیں پھیر کر غافل نہیں رہنا چاہئے کیونکہ نفس امارہ ہمیشہ انسان کو گمراہی کی طرف راغب کرتا رہتا ہے اور اس کی تاک میں رہتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خوفناک اژدھا جو کبھی نہیں مرتا۔ مصرع

"نفس اژدرھا است او کئی مردہ است"

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو اپنے شاگردوں نوکروں اور ماتحتوں کا رب خیال کرتے ہیں اور اپنی پندار کا اس طرح اظہار کرتے ہیں کہ میرے شاگردوں کو چاہیے کہ میری تعظیم کیا کریں نوکروں اور کنیزوں کو چاہیئے کہ میرے آگے جھکا کریں گویا وہ ان کے رب ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بندگی کے منصب کے خلاف ہے۔

نصیحت کارگر ثابت ہوتی ہے۔

کبھی کبھار نصیحت و موعظت سے ان میں بندگی کا احساس بیدار ہو جاتا ہے اور ذرا دیر کے لئے یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اس کی ہستی اور تمام عالم موجودات خدا کی مخلوق ہیں اور وہ بھی دوسری تمام مخلوقات کی طرح خدا ہی کے محتاج ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ

(سورہ فاطر۔ آیت ۱۵)

جس وقت تک دنیا کی دلفریبیوں اور اسکی بندگی سے اپنے آپ کو بچائے رکھتا ہے تو پند و نصیحت اس پر اثر بھی کرتی ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ اے خدا میں تو کافر تھا اب میں اپنے عہد کی تجدید کرتا ہوں اور تجھ پر ایمان لے آتا ہوں۔ آمنت باللہ کہکر اللہ سے وعدہ کرتا ہے کہ اب میں اپنی ذات اور اس دنیوی زندگی کی فکر سے باز آیا اپنے آپ کو خود مختار نہیں بلکہ تیرا عاجز مجبور بندہ گردانتا ہوں ہر چیز کا تو ہی مالک ہے اور میں خود کسی چیز کا مالک نہیں۔ "لَا يَمْلِكُ لِنَفْسِهٖ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا وَّلَا مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا" (نماز کے بعد کی دعا) لیکن پھر سے خدائی اور کبریائی کا دعوی کرنے لگتا ہے۔ کہاں تو اپنی عبودیت اور بندگی کا اعلان کر رہا تھا اور روحانیت پر مائل تھا اور اب یہ حال ہے کہ اپنے کفر کی اولین حالت پر لوٹ آتا ہے۔ غصہ کی حالت میں اس کی یہ کیفیت تو اپنے عروج پر ہوتی ہے چنانچہ کسی سے جھگڑ پڑے اور تم اس کے باطن پر نگاہ ڈالو تو دیکھو گے کہ اس میں کفر ہی کفر بھرا ہو گا۔ بندگی اور عبودیت کا شائبہ تک نہ پاؤ گے۔

اس غلام کا قصہ جس نے حضرت سجادؑ کے بچہ کو ہلاک کر دیا۔

حضرت زین العابدینؑ کے حالات زندگی میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ حضرت کی خدمت میں چند مہمان آئے ہوئے تھے اور انکی تواضع کے لئے سیخ کے کباب تیار کئے جا رہے تھے۔ غلام گرم گرم سیخ تنور میں سے نکال کر لانے لگا حضرت امامؑ کا ایک چھوٹا بچہ راستہ میں آگیا۔ سو۔ اتفاق سے کباب کی گرم گرم سلاخیں غلام کے ہاتھ سے چھوٹ کر بچے کے سر اور منہ پر جا گریں اور اسی وقت

بچہ کی موت واقع ہو گئی۔

غلام نے بڑی چالاکی سے کام لیتے ہوئے قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت کرنی شروع کر دی۔

"وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ. (سورہ آل عمران - آیت ۱۳۴)"

حضرتؑ نے فرمایا کہ میں اپنے غصہ پر قابو رکھتا ہوں اور "وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ" کے الفاظ سنا کر اسے معاف کر دیا پھر آیت قرآنی "وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ" کی تلاوت کرتے ہوئے فرمایا کہ جا میں نے تجھ کو اللہ کی راہ میں آزاد کر دیا۔

سوچو تو جو شخص خدا کی عبودیت میں راسخ نہ ہوا ہو غصہ کی حالت میں کیا کچھ بکواس نہیں کرتا اور کیسی بے جا حرکات اس سے سرزد نہیں ہو جاتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی ذرا سی غفلت اور ایک معمولی حرکت سے وہ خدا کی بندگی اور عبودیت حق کی راہ سے دور جا پڑتا ہے۔

امام زین العابدینؑ جو عبادت گزاروں کی زینت ہیں۔ ان ہی سے متعلق ایک اور حکایت بھی ان کی عبودیت اور اس پر سختی سے قائم رہنے کا ثبوت ہے جس کو ہم بیان کرنا چاہتے ہیں۔

غلام کو تنبیہ کر کے آزاد کر دیا۔

منتھی الامال میں لکھا ہے کہ امام زین العابدینؑ کے غلاموں میں سے ایک غلام سے کسی جرم کا ارتکاب ہو گیا جس پر اس کی تنبیہ ضروری تھی۔ حضرتؑ نے اسے ایک کوڑا مارا اور فوراً ہی تازیانہ غلام کے ہاتھ میں دیدیا اور

فرمایا کہ تم چاہو تو مجھ سے اس کا قصاص لے لو۔ میں نے تو محض تیری تادیب کے لئے تازیانہ لگایا تھا۔ غلام نے جب یہ صورت حال دیکھی تو معذرت مانگنے لگا اور کہا کہ میرے ہاتھ کٹ جائیں قبل اس کے کہ میں ایسی حرکت کرنے کی جسارت کروں۔

اس پر حضرتؑ نے اسے پچاس دینار عطا کر دیئے اور کہا کہ تو آزاد ہے۔

غصہ بندگی کے حدود سے خارج کر دیتا ہے۔

بہرحال غصہ کے عالم میں مناسب طرزِ عمل یہی ہے کہ بندگی کی حدود سے تجاوز نہ ہونے پائے اس لئے محتاط رہنے کی ضرورت ہے زبان سے تو کہتے ہو "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کہ اے خدا ہم تنہا تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد کے طلب گار ہیں لیکن یکایک تمہیں کیا ہو گیا کہ کہتے ہو اگر ہمارے پاؤں ہی نہ ہوتے تو ہم فلاں فلاں گناہوں کا ارتکاب ہی نہ کر سکتے۔ لیکن یہ کہکر بھی تم خدا کی گرفت سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔

سید بحرالعلوم نے اپنی ایک نظم میں اس موضوع کو کتنی خوبصورتی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ایاک من قول بہ گفتند۔ وانت غیراللہ کیت تعبد
تلہج فی ایاک نستعین۔ وانت غیر اللہ تستعین

یعنی زبان سے تو کہتے ہیں ہم تیری مدد کے خواستگار ہیں لیکن عمل سے یہ ثابت کرتے ہو کہ اپنے یا غیر خدا سے مدد مانگ رہے ہو۔

جب تک طمانیت قلب حاصل نہ ہو تذبذب سے چھٹکارا نہیں۔

اس ساری بحث سے میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک نفس کو طمانیت حاصل نہ ہو جائے وہ تذبذب سے چھٹکارا نہیں پا سکتا اور کبھی اس طرف اور کبھی اس طرف یعنی معلق ہو کر تزلزل کا شکار ہوتا رہے گا۔ کبھی تو خود بینی اور شہوات میں مبتلا ہوگا اور کبھی خدا کی طرف رجوع کرے گا۔ لیکن نفس مطمئنہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ایک لحظہ کے لئے بھی خود پسندی انانیت اور بے راہ روی کی طرف رغبت نہ ہوگی نیز اپنے آپ کو مالک یا رب یا معبود کے رتبہ پر فائز خیال نہیں کریگا۔ اس کے برعکس اس یقین واثق پر قائم رہے گا کہ وہ تو اللہ کا بندہ ہے اور اسی سے وابستہ یعنی "یَامَنْ کُلُّ شَیْءٍ قَائِمٌ بِہٖ"

دعائے کمیل میں بھی ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں۔ "یَامَنْ بِیَدِہٖ نَاصِیَتِیْ" کہ اے خدائے دو عالم میری زندگی میری بقا۔ اور میری جان تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ میرا نفس جو مجھے کہیں لیجاتا اور لاتا ہے تو وہ میرے اختیار میں نہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری نگاہ جب کسی چیز پر پڑتی ہے تو مجھے اس کی بھی امید نہیں ہوتی کہ وہ واپس آسکے گی۔ میں اس حد تک بے اختیار ہوں۔ اسی کا بندہ ہوں اسی کی مخلوق ہوں۔ نہ تو میرا اپنا وجود پائیدار ہے اور نہ میرے جسم کے ذرات نہ اپنی صفات اور نہ اپنے افعال کے تعلق سے کسی قسم کا بھی کوئی اختیار رکھتا ہوں۔ پس یہ لازمی بات ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہیں ہو سکتی جو عبودیت کے خلاف ہو۔ معصومین جو حقیقی بندے ہیں بندگی اور عبدیت

کے لئے انہی کی روش اختیار کرو تاکہ نفس مطمئنہ تک تمہاری رسائی ہو سکے۔

امام صادقؑ کا ایک کنیز پر ترس کھانا اور کبیدہ خاطر ہونا۔

امام مالک بن انسؒ کے بارے میں جو فقہ مالکی کے بانی ہیں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک دن مدینہ منورہ کی گلی میں سے گزر رہے تھے۔ دیکھا کہ امام صادقؑ پریشان سے نظر آرہے تھے۔ پتہ چلا کہ انہیں کسی بات کا صدمہ ہے جس سے وہ رنجیدہ اور کبیدہ ہیں۔ امام مالک کھڑے ہوگئے اور دریافت کیا کہ اے آقا کیا حادثہ پیش آگیا ہے کہ آپ کو پریشان اور رنجیدہ دیکھ رہا ہوں۔

امام صادقؑ نے فرمایا کہ میرے مکان کی دو منزلیں ہیں اور اوپر والی منزل میرا اطاق یعنی کرہ ملاقات ہے اس منزل پر پہنچنے کے لئے ایک زینہ ہے جس سے اوپر پہنچ سکتے ہیں۔ میں نے اہل خانہ کو تاکید کر رکھی تھی کہ کوئی اس زینہ کو استعمال نہ کرے اور اوپر نہ جائے۔ لیکن آج جب میں گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک کنیز بچہ کو گود میں لئے اسی زینہ سے اوپر جارہی ہے۔ جونہی میں داخل ہوا وہ مجھے دیکھ کر ڈر گئی اور چاہتی تھی کہ واپس لوٹ جائے۔ ایسے میں بچہ اس کی گود سے گر پڑا اور اسی وقت اس کی موت واقع ہوگئی۔ مجھے بچہ کی موت کا اس قدر افسوس نہیں۔ مجھے رنج تو اس بات کا ہے کہ وہ کنیز کیوں مجھ سے خوف زدہ تھی۔ ڈرنا تو اللہ سے چاہیئے نہ کہ مخلوق خدا سے۔

امام صادقؑ کو دراصل یہ خیال ستا رہا تھا کہ کنیز کو خدا کے خوف کے بجائے میرا خوف دامن گیر تھا حالانکہ میں تو بندہ ہوں۔ حق تعالیٰ سبحانہ کے مقابلہ میں وہ مجھ سے خائف ہوگئی جس کا مجھے افسوس ہے۔

اللہ رب العزت کے آگے انتہائی عجز و انکسار کا اظہار کرنا چاہیئے۔

شریف روایت کرتے ہیں کہ حضرت صادق کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا - نہایت ادب و احترام سے حضرت کے سر مبارک کو بوسہ دیا اور پھر آپ کی پیشانی اور ہاتھ چوم کر امام موصوف کے پیروں پر گر پڑا تاکہ آپ کے پیروں کا بھی بوسہ لے سکے - حضرت نے اسے فوراً ہی ٹوک دیا کہ یہ کیا کرتے ہو - میرے پاؤں پر گرپڑے ہو حالانکہ میں بھی عبد ہوں - خدا کے لئے ایسی حرکت نہ کرو - اس طرح کی عاجزی اور تذلل اللہ جل شانہ کے سوا اور کسی کے لئے سزاوار نہیں۔

امام موصوف کے نفس مطمئنہ کی مثال۔

غرضیکہ عبودیت کا یہ تقاضا ہے کہ کسی حالت میں بھی غفلت اس پر غالب نہ آجائے اور بندہ اپنے مقام کو فراموش نہ کردے - یہ کیفیت بدرجہ کمال معصوم ہی میں ہو سکتی ہے - کیونکہ وہ ایسا نفس مطمئنہ ہے جو ایک لمحہ کے لئے بھی امارگی کی طرف مائل نہیں ہوتا - وہ نہ تو خواہشات کا اور نہ اپنے نفس کا اور نہ دنیا کا بندہ ہوتا ہے اور نہ اپنی خودی کو آزاد و خود مختار خیال نہیں کرتا - کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اپنے آپ میں مگن رہے اور یہ نہ سوچے کہ میں خود تو دیکھ سکتا ہوں اور خدا کے بارے میں اس طرح خیال آئے گویا وہ تو دیکھ ہی نہیں رہا ہے - اور اسی کا نام معصومیت ہے۔

آجائے تو استغفار کرے اور دوبارہ اپنی بندگی اور عبودیت کا اقرار کرے۔

تمہارے لئے جو آگ دہک رہی ہے اسے بجھانے کی فکر کرو۔

جناب سید بن طاؤس نے اپنی کتاب فلاح السائلین میں ایک روایت بیان کی ہے کہ پنج گانہ نمازوں کے اوقات میں فرشتے کی ندا آتی ہے کہ اے مسلمانو نماز کے لئے اٹھو اور اس آگ کو بجھانے کی فکر کرو جو تمہارے لئے دہکائی جارہی ہے۔

ظہر کی نماز کا وقت ہو رہا ہے - اے شخص تو نے زندگی بھر اپنے نفس کی اطاعت کرتے ہوئے جو آگ روشن کی ہے اٹھ اور نماز کی برکت سے اسے بجھا دے - اس کفر حقیقی کی آگ کو جس نے تجھے خدا کی بندگی سے باز رکھا - پس اقرار کر - کہ تو خدا کا بندہ ہے - سرتاپا نیاز ہے - اور میں میں کہنا چھوڑ دے اور شیخی بگھارنے سے اجتناب کر کہ میں یہ کر سکتا ہوں وہ کر سکتا ہوں۔

خدا کا نام لے اور میں میں کی رٹ لگانے سے باز آجا - اپنے نفس اور اپنی خود مختاری کے راگ کب تک الاپتا رہے گا - ادھر آ اور خود بینی و خود مختاری کا طوق اتار کر پھینک دے - جس آگ کو تو نے اپنی بداعمالیوں سے خود روشن کیا ہے اسے بجھانے کی فکر کر۔

آجائے تو استغفار کرے اور دوبارہ اپنی بندگی اور عبودیت کا اقرار کرے۔

تمہارے لئے جو آگ دہک رہی ہے اسے بجھانے کی فکر کرو۔

جناب سید بن طاؤس نے اپنی کتاب فلاح السائلین میں ایک روایت بیان کی ہے کہ پنج گانہ نمازوں کے اوقات میں فرشتے کی ندا آتی ہے کہ اے مسلمانو نماز کے لئے اٹھو اور اس آگ کو بجھانے کی فکر کرو جو تمہارے لئے دہکائی جارہی ہے۔

ظہر کی نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ اے شخص تو نے زندگی بھر اپنے نفس کی اطاعت کرتے ہوئے جو آگ روشن کی ہے اٹھ اور نماز کی برکت سے اسے بجھا دے۔ اس کفر حقیقی کی آگ کو جس نے تجھے خدا کی بندگی سے باز رکھا۔ پس اقرار کر۔ کہ تو خدا کا بندہ ہے۔ سرتاپا نیاز ہے۔ اور میں میں کہنا چھوڑ دے اور شیخی بگھارنے سے اجتناب کر کہ میں یہ کر سکتا ہوں وہ کر سکتا ہوں۔

خدا کا نام لے اور میں میں کی رٹ لگانے سے باز آجا۔ اپنے نفس اور اپنی خود مختاری کے راگ کب تک الاپتا رہے گا۔ ادھر آ اور خود بینی و خود مختاری کا طوق اتار کر پھینک دے۔ جس آگ کو تو نے اپنی بداعمالیوں سے خود روشن کیا ہے اسے بجھانے کی فکر کر۔

"وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً"

(سورہ اعراف۔ آیت ۲۰۵)

نماز بدترین غفلت کا علاج ہے۔

سچ پوچھو تو پنج گانہ نماز کا التزام نہ ہو تو انسان حقیقی ایمان کے راستہ پر گامزن ہو ہی نہیں سکتا۔ اور غفلت اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ پس نماز کے ذریعہ یاد الہٰی میں غرق ہو کر اس کا شکر ادا کر کیونکہ نماز ہی سے ایمان اور ہدایت کی سیدھی اور کشادہ راہ کی طرف تیری رہنمائی ہوتی ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ

(سورہ طہٰ۔ آیت ۱۴)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک روایت کے مطابق نماز کی مثال ایک ایسے دریا کی ہے جس میں آدمی ہر روز پانچ مرتبہ نہا لیا کرے تو وہ ہمیشہ پاک ہی رہیگا۔ یعنی یہ پانچ وقت کی نماز ایسی ہے کہ انسان کو اپنی غفلت اور خود مختاری کے زعم باطل نیز اپنے جھوٹے پندار سے نجات مل جاتی ہے۔ پس اٹھ اور خشوع و خضوع کے ساتھ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کا اقرار کر کہ میں تو بندہ ہوں اور تیرے ہی کرم کا محتاج ہوں اس طرح کہ یہ عاجز و حقیر خدائے وحدہ لاشریک ہی کا بندہ ہے نہ کہ کسی غیر خدا کا محتاج۔ میری غفلت اور میں میں کے تمام دعوے جھوٹے اور باطل ہیں۔ خدائے غفور و رحیم مجھے بخش دے اور میری توبہ قبول فرما۔ "اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ" میں نے الوہیت کے جتنے بھی دعوے کئے ہیں ان سے توبہ کرتا ہوں۔ "استغفر اللہ" میں تو تیرا ہی بندہ ہوں اور تیری ہی عبادت کرتا ہوں۔

نفس لوامہ خود سرزنش کرتا ہے۔

اگر بھلائی چاہتے ہو تو آؤ اور صراط مستقیم پر چل پڑو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ

اس راستہ پر چلنے اور استقامت کے ساتھ اسے پکڑے رہنے والوں کا حامی و مددگار ہوتا ہے۔ پس جلدی کرو اور توبہ و استغفار کرکے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ اور معافی اس طرح مانگو جس طرح قرآن مجید میں مذکور ہے۔ آدھی رات کے بعد گڑگڑا کر اس سے معافی کے طلب گار ہو جاؤ اور اے جھوٹے تو کہتا تو ہے کہ تو خدا کا بندہ ہے لیکن کیا بندگی کا یہی طریقہ ہے جس پر تو اب تک عمل پیرا رہا ہے۔

نفس کی یہ کیفیت نفس لوامہ سے ہمکنار کرتی ہے۔ یعنی انسان پہلے پہل تو خود کو ملامت کرتا ہے پھر اس کی تنبیہ اور سرزنش کرکے اپنی برائیوں پر نگاہ ڈالتا اور اس کی اصلاح کے لئے آمادہ کرتا ہے تاکہ نفس مطمئنہ تک اس کی رسائی ہو جائے۔ معلوم یہ ہوا کہ نفس لوامہ وہ ہے جو اپنی انانیت اور خود سری سے باز رکھتا ہے اپنے عیوب پر نظر رکھتا اور اس کی تنبیہ و سرزنش کرتا رہتا ہے۔

ہمہ عیب خلق دیدن نہ مروت است نہ مردی
نظری بخویشتن کن کہ ہمہ گناہ داری

اپنے نفس سے کہو کہ اے کذاب بھلا اتنی اکڑ کیوں دکھا رہا ہے جبکہ تیرے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ حاجی شیخ عباس قمی پر رحم فرمائے کہ انہوں نے منتہی الامال نامی دلچسپ اور مفید کتاب لکھ کر فارسی زبان میں چہاردہ معصومینؑ کے حالات بڑے ہی خوبصورت انداز میں تحریر کئے ہیں۔ مومنوں کو چاہیئے کہ اس سے استفادہ کریں۔ چنانچہ حضرت زین العابدینؑ کے بیان میں لکھتے ہیں کہ امام موصوف رو رو کر اپنے نفس کو مخاطب فرماتے

اور اس پر لعن طعن کرتے تھے۔

نفس کی لوامگی قلب کے اطمینان کا پیش خیمہ ہے۔

غرض کہ مقصود یہ ہونا چاہیئے کہ نفس لوامہ کا درجہ حاصل ہو جائے تاکہ نفس مطمئنہ تک رسائی ہو سکے۔ انسان کا ایک ایک گھنٹہ جو گزرتا ہے تو اس کا باطن ہر دفعہ ایک نیا روپ دھارتا ہے۔ کبھی تو اس کا نفس ریچھ کی مانند درندگی پر اتر آتا ہے اور کبھی بندر کا شیوہ اپناتا ہے۔ بندر کا کام تو نقالی ہے۔ چنانچہ اسی کی تاسی میں ہو کر کہنے لگتا ہے کہ فلاں شخص فلاں کام کر رہا ہے لہذا مجھے بھی وہی کرنا چاہیئے۔ تمہیں چاہیئے کہ اپنے عیبوں کو یاد کرو تاکہ بتدریج نفس مطمئنہ کے مقام تک پہنچ سکو۔ اور اپنے آپ سے اس طرح مخاطب ہو کہ میں کیا اور میری بساط کیا۔ نفس مطمئنہ تک کہاں میری رسائی ہو سکتی ہے البتہ اللہ تعالیٰ کی مدد شامل ہو تو میں اس کی طرف لو لگانے کے قابل ہو جاؤں اور بندگی کا راستہ اختیار کر لوں یعنی عبداللہ اور عبدالرحمن بن جاؤں نہ کہ عبدالشیطان۔

پس ہمیں چاہیئے کہ کم سے کم نفس لوامہ کے حصول کے لئے کوشاں رہیں اور خدا کی عبودیت میں ہم سے جو کوتاہیاں رہ جائیں اس پر اظہار ندامت کرتے ہوئے عاجزی اور تضرع سے اس کی معافی کے خواستگار رہیں۔ اور لوامہ کے بعد کے مقامات سے ہمکنار ہونے کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔

غفلت کیوں غلبہ پا لیتی ہے۔

اس موقع پر ہم نفس لوامہ کی مناسبت سے ذیل میں حضرت سجادؑ کی وہ

دعا یاد دلاتے ہیں جسے ابو حمزہ نے نقل کیا ہے۔

"مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں گمان کرتا ہوں کہ میں نیک ہوں۔ نیکو کاروں کی صحبت میں رہتا ہوں اور یہ کہ میرا ہر قدم نیکی اور فلاح اور تیری بندگی کی جانب اٹھتا ہے نیز یہ کہ میں اطمینان قلب کی دولت سے سرشار ہوں۔ لیکن پھر بھی غفلت مجھ پر غلبہ پا لیتی ہے۔ میں بندگی کے راستے سے دور جا پڑتا ہوں۔ میرے پاؤں کو لغزش ہوتی ہے اور اپنی خود مختاری اور پندار کے زعم میں تیری عبودیت سے گریزاں رہتا ہوں اور غفلت مجھے تیری خدمت کے شرف سے محروم کر دیتی ہے۔"

"رات کے پچھلے پہر جب ارادہ کرتا ہوں تو اٹھ بیٹھتا ہوں اور اے پروردگار تیرے ساتھ راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں لیکن اونگھ مجھ پر غالب آ جاتی ہے اور میری مناجاتیں ادھوری رہ جاتی ہیں۔"

"اے مالک دو جہاں۔ شاید تو نے مجھے راندہ درگاہ کر دیا اور اپنی بندگی کے قابل نہ سمجھ کر مجھے دور کر دیا۔"

اس دعا کے یہ الفاظ بطور خاص غور طلب ہیں۔

پروردگار عالم۔ تو شاید میرا شمار دروغ گویوں میں کرتا ہے۔ تو نے دیکھا کہ میں نماز میں تو "ایاک نعبد" کہتا ہوں اور تیرا بندہ ہوں لیکن اپنی خود مختاری حتیٰ کہ خدائی کا بھی دعویدار ہوں۔ میری دروغ گوئی یہ بھی ہے کہ زبان سے "وایاک نستعین" کہتا ہوں اور عمل میرا یہ ہے کہ اسباب پر میری نظر ہوتی ہے خدا پر نہیں۔"

"میری ان خطاؤں اور لغزشوں کے باوجود تو مجھے بخش دے اور گناہوں سے پاک کر دے۔ بارالہا تو غفور در گزر پر قادر ہے رحم کرنا تیری عادت ہے اور تو تمام رحم کرنے والوں میں سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔ لیکن اگر مجھے

عذاب دے اور مجھے دھتکار دے تو یہ بھی مجھ پر تیرا ظلم نہ ہوگا کیونکہ میں تو اسی کا مستحق تھا کیونکہ میں دروغ گوئی سے کام لیتا رہا۔"

"اے رب العالمین - اپنے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی آل کے طفیل میں ہماری کوتاہیوں اور ہمارے عیوب کو جانتے ہوئے ہمیں نفس لوامہ عنایت فرما۔ ہر حال میں انابت اور توبہ کی توفیق عطا فرما۔ اور اپنی نظر کرم سے محروم نہ کر۔ اگر تو نے مجھے چھوڑ دیا تو میں ہلاک ہو جاؤنگا۔"

باب پنجم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي

(سورہ الفجر۔ آیت ۲۷، ۳۰)

رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ اطمینان قلب ہے۔

نفس مطمئنہ کی شرح و تفسیر میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کے بلند مقامات اور توحید کے درجات میں سے ایک عظیم مقام کا وہ حامل ہے بلکہ انسانیت کے شرف و مجد کا آخری مقام و مرتبہ اسی کو

کہنا چاہئے ۔ اس مقام کو حاصل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ رجوع الی الرب (اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ) تک رسائی ہو جائے اور وہ اطمینان قلب و نفس کی ایسی منزل ہے جو تسلیم و رضا سے عبارت ہے۔

انسان جب نفس مطمئنہ کا حامل ہو جائے تو بندگی کے اظہار کے لئے خدا کی راہ میں اور دین کی خاطر بے دریغ مال خرچ کرتا رہتا ہے تاکہ اسے اطمینان نصیب ہو اور اس کی بے چینی کا ازالہ ہو جائے ۔ ایسا اطمینان جو اضطراب کی نیز رنج اور وحشت کی ضد ہے۔

خدا پر بھروسہ اضطراب کا قلع قمع کر دیتا ہے۔

انسان کا نفس جو پہلے اپنے آپ پر اور اپنے اسباب پر بھروسہ کرتا ہے خود کو مالک و مختار خیال کرتا ہے ۔ حالانکہ فی الحقیقت اس کا نفس ہمیشہ مضطرب و بے چین اور رنجیدہ و ملول رہتا ہے تاآنکہ وہ یقین کی منزل مراد نہ پالے یعنی یہ یقین نہ کرلے کہ صرف خدا ہی مالک حقیقی ہے وہی قیوم ہے نیز اپنے آپ کے اور اس عالم موجودات کی ہر شے کے بارے میں یہ یقین پختہ ہو جائے اور کسی تذبذب کا شکار نہ ہو تو پھر اس کے لئے نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ کسی بات کا رنج ہوگا کیونکہ اب وہ اولیاء میں شامل ہو چکا ہوگا۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔

(سورہ یونس ۔ آیت ۶۲)

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ جو شخص بھی ایمان لائے گا اور تقویٰ کا پاسدار انتخاب کرے گا ۔ نیز اپنی ساری عمر تقویٰ اور پرہیزگاری میں گزارے گا

بندگی کے راستہ پر ثابت قدمی سے گامزن رہے گا اور اس عالم کی تخلیق کے بارے میں اور توحید الہیٰ پر غور و فکر سے کام لیتا رہے گا تو اس کی رسائی اس مقام تک ہو جائیگی جہاں اسے اطمینان قلب حاصل ہو گا اور کسی قسم کے اضطراب اور وحشت کا سامنا کرنا نہ پڑے گا۔

"اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ"

(سورہ یونس ۔ آیت ۶۳)

آج کے دور میں بنی نوع انسان کے سارے مصائب کفر کا نتیجہ ہیں۔

تم دیکھتے ہو کہ آج کے دور میں سارا عالم انسانیت خواہ اس میں مسلمان ہوں یا یہودی، نصرانی ہوں یا دوسرے مادہ پرست، سب کے سب وحشت و اضطراب کا شکار ہیں۔ ہم روزمرہ کی زندگی میں خود بھی اسے محسوس کرتے ہیں اور آئے دن اخبارات و رسائل اس قسم کی خبروں سے بھرے رہتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کرہ ارض پر بنی نوع انسان کی زندگی وبال جان بن چکی ہے اور اضطراب و بے چینی نے ہر شخص کا راحت و آرام ہی چھین لیا ہے چاہے وہ لکھا پڑھا ہو کہ ان پڑھ، فقیر ہو کہ امیر، رئیس ہو کہ عامۃ الناس، سب ہی پریشانی میں مبتلا ہیں کیونکہ وہ توحید کے راستہ سے دور جا پڑے ہیں۔ توحید سے روگردانی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ پر اور اپنے اسباب پر بھروسہ کئے رہتے ہیں اور اسی وجہ سے حزن و ملال اور خوف و دہشت سے انہیں چھٹکارا نہیں ملتا۔ چنانچہ اگر وہ دنیوی اسباب و وسائل سے محروم ہو جائیں تو کبیدہ

خاطر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اپنے مال واولاد اور معاشرے میں اپنی عزت وآبرو کے بارے میں یہ گمان رکھتے ہیں کہ انہیں دوام حاصل ہے اور وہی ان کے حاجت روا بھی ہیں۔ لہذا جب ان میں سے کوئی یک بھی ان کے قبضہ وتصرف میں نہ رہے تو انہیں سخت رنج اور قلق ہوتا ہے۔ اور فوری پریشانی لاحق ہو جاتی ہے۔ طرفہ یہ کہ دنیوی اسباب پر اس حد تک ان کا بھروسہ ہوتا ہے اور انہیں دنیوی امور میں ان کے کارآمد ہونے پر اتنا یقین ہوتا ہے کہ نتیجتاً ساری حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں اور قناعت کا دامن ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ لاکھوں کی دولت بھی ان کی ضروریات کی تکمیل کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ سینکڑوں علاقے فتح کر لینے اور بے شمار ممالک پر قبضہ جمانے اور جاہ و جلال کے نقطہ عروج پر پہنچنے کے بعد بھی ان کی حرص و طمع ختم نہیں ہوتی۔ ہر وقت یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ ان کی احتیاجات و خواہشات کی تکمیل کے لئے یہ سب کچھ ناکافی ہے۔ ان کا اضطراب بڑھتا ہی جاتا ہے کہ اب کیا ہو گا کیونکہ وہ امید کے بجائے ناامیدی اور آس کے بجائے یاس کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ مال و اسباب اکٹھا کر کے بھی وہ چین سے نہیں رہ سکتے۔ اس کے برعکس جو لوگ ولایت اعلیٰ کے رتبہ پر فائز اور توحید کے راستہ پر گامزن ہوں انہیں نہ تو کسی قسم کا خوف دامنگیر ہوتا ہے اور نہ کسی غم واندوہ میں وہ مبتلا ہوتے ہیں۔

"اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ"

(سورہ یونس۔ آیت ۶۲)

کیونکہ ان کا بھروسہ صرف مبدء اصلی و ازلی و ابدی یعنی ذات خداوندی پر ہوتا ہے۔

میں میں کی رٹ لگانا چھوڑ دے۔

پس انسان کو چاہیئے کہ اس طرح کی سرکشی اور سرتابی سے ڈرتا رہے اس کفر سے توبہ کرلے جس نے اس کے دل میں گھر کر لیا ہے اور بڑھتا ہی جارہا ہے سوچ سمجھ سے کام لے اور یہ جاننے کی کوشش کرے کہ وہ خود کون ہے یعنی پہلے اپنے آپ کو پہچاننے کی فکر کرے۔ میں میں کی رٹ لگانا چھوڑ دے کہ تو ایک حقیر و عاجز بندہ ہے اور مالک کوئی اور ہے۔ تو اپنی کسی شے کا مالک نہیں۔ نہ اپنی ذات کا، نہ اپنے نفع و نقصان کا، نہ اپنی موت وزیست کا اور نہ قیامت کے دن کا۔

جب تک یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آجائے اور اس کفر سے جو، اب پختہ ہوتا جارہا ہے توبہ نہ کرلے اور شرک سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر نہ کرلے اس کی نجات ممکن نہیں۔ جان لو کہ تمہارا کوئی مالک ہے جو قیوم ہے اور تمہاری ہستی اپنے آپ وجود میں نہیں آئی بلکہ غیبی طاقت نے تمہیں یہ حیات مستعار عطا کی ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ اسی عالم الغیب کے دامن سے وابستہ ہے۔

"فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ"

(سورہ یٰسٓ - آیت ۸۳)

تم بھی موجودات عالم میں سے ایک ہو اور اجزائے عالم ہی تمہاری ہستی کے عناصر ترکیبی ہیں۔

کائنات خدا کی ملکیت اور سارے موجودات اس کے بندے ہیں

انسان کو چاہیئے کہ وہ خود کو اس کا بندہ اور غلام جانے نیز ساری کائنات میں اسی کی بادشاہت پر یقین رکھے۔ خداوند عالم نے قرآن مجید میں بار بار ارشاد فرمایا ہے جبکہ ہم بدبخت ہیں کہ اس پر کان نہیں دھرتے یعنی۔

"لَهُ مُلْكُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ"

تمہارا اپنا وجود اور عرش تا فرش کا ایک ایک ذرہ کائنات اسی کی ملکیت ہے۔ کسی کو نہ دوام و بقاء ہے اور نہ کسی کا وجود اس کی قدرت سے بے نیاز۔ حتی کہ سانس لینے پر بھی تمہیں اختیار نہیں ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اپنے اختیار سے کوئی کام کر سکے۔ اسباب اور وسائل ہیچ ہو کر رہ جائیں اگر خدا کی مرضی نہ ہو۔

مال و دولت کسی کام نہیں آتے۔

بیچارا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ملک اور حکومت، مال و دولت اور جاہ و ثروت سے اس کے تمام کام نکل سکتے اور مادی حاجتیں پوری ہو سکتی ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن کے ہاں دولت کے انبار لگے ہیں اور انہوں نے اربوں روپیہ اکٹھا کر لیا ہے لیکن جب کوئی بیماری انہیں گھیر لیتی ہے تو یہ ساری دولت دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور فائدہ مند ثابت نہیں ہوتی یہاں تک کہ ان کی موت واقع ہو جاتی ہے موت کے مقابلہ پر اس کا مال کسی کام نہ آیا اور وہ اپنے آپ کو بھی موت سے نہ بچا سکا۔ بیماری کا علاج اور شفا تو

خدا کے ہاتھ میں ہے۔ محض دولت کے بل بوتے پر کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ صحت اور تندرستی بھی خرید سکتا ہے۔

"مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا کَسَبَ"

(سورہ لہب۔ آیت ۲)

ایک ملکہ کا حال جس نے بھوک کے مارے جان دیدی۔

مستطرف کی کتاب میں یہ حکایت ملتی ہے کہ ایک مرتبہ دریائے نیل کے کنارے آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران ایک صندوق ملا جس کے اندر ایک حنوط کی ہوئی لاش رکھی ہوئی تھی۔ پتہ چلا کہ یہ تو کسی ملکہ کی لاش تھی قدیم مصر میں یہ رواج تھا کہ فراعنہ اور اس زمانہ کے امیر کبیر لوگوں کی لاشوں کو مومیائی یا حنوط کے عمل کے ذریعہ محفوظ کر دیا جاتا تھا۔

اس صندوق میں لاش کے ساتھ بے شمار قیمتی جواہرات بھی پائے گئے اور ایک تختی بھی جس پر ملکہ نے اپنی موت کے وقت بطور وصیت عبارت کندہ کروائی تھی کہ میرے مرنے کے بعد جو کوئی بھی میری لاش کو دیکھے اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میری سلطنت میں جب قحط پڑا تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں نے چاہا کہ اپنے تمام جواہرات کے بدلے روٹی کا ایک ٹکڑا میسر آجائے لیکن مجھے روٹی کا ٹکڑا بھی نہ مل سکا اور بالآخر میری موت واقع ہو گئی۔ پس لوگ اس سے عبرت حاصل کریں کہ مال و دولت سے ہر چیز خریدی نہیں جا سکتی تاوقتیکہ خدا نہ چاہے۔ اسی طرح لوگ یہ خیال نہ کر لیں کہ وہ ہر کام کی آزادی اور اختیار رکھتے ہیں۔ ذرا اپنی آنکھیں کھولو اور دیدہ عبرت نگاہ سے دیکھو تاکہ ظاہری چیزوں سے فریب میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ جب تک خدا کی مرضی نہ ہو

تم چاہے سارے جہاں کی دولت اور وسائل جمع کر لو پھر بھی کسی کام کو انجام دینے میں تم کامیاب نہیں ہو سکتے۔

حجاج بن یوسف کا سردی میں ٹھٹھر کا مرنا۔

کہتے ہیں کہ حجاج بن یوسف پر مرنے سے پہلے سردی کا اس قدر شدید حملہ ہوا کہ متعدد لحاف اوڑھنے کے باوجود اس کی کپکپی کم نہ ہوئی۔ آگ کی انگیٹھیاں اس کے بستر کے چاروں طرف رکھدی گئیں لیکن سردی کے زور کو کم نہ ہونا تھا نہ ہوا یہاں تک کہ آگ کی گرمی سے اس کے جسم کی جلد تک جھلس گئی۔ پھر بھی وہ یہی کہتا رہا کہ سردی نے اسے دبوچ لیا ہے اور اس کا جسم کانپتا رہا۔ بالآخر اسی حالت میں اس کی موت واقع ہوگئی۔

بات یہ ہے کہ خدا کو اس کی صحت منظور نہ تھی لہذا آگ آتشدان یا لحاف اور قالین کیا فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ یہ اسباب تو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہیں اور شفا دینا اسی کے اختیار میں ہے جبتک وہ نہ چاہے اسباب دنیوی اپنا اثر نہیں دکھا سکتے کیونکہ اسباب بھی تو اسی کے پیدا کردہ ہیں۔

اطمینانِ نفس کے لئے توحید پر مضبوطی سے قائم رہنا ضروری ہے۔

ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہونا چاہئے کہ توحید کے راستہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں۔ کفر اور شرک سے توبہ کرتے رہیں تاکہ توحید کے راستہ سے بھٹکنے نہ پائیں۔ یہ نہ ہو کہ کبھی توحید کی باتیں ہو رہی ہیں اور کبھی کفر و

شرک والی حرکتیں سرزد ہورہی ہو۔ یعنی محراب و منبر میں تو نصیحت آمیز بیان اور استغفر اللہ کے ذریعہ خدا کی بخشش کے طلب گار رہتے ہو اور جب اپنے گھر پہنچتے ہو یا بازار میں نکلتے ہو تو تمہارا رویہ ہی بدل جاتا ہے۔ گویا کفر اور ایمان کو ساتھ ساتھ لئے چلتے ہو۔ کبھی یہ اور کبھی وہ۔ یہ روش توحید کامل کے منافی اور اطمینان نفس کی کیفیت سے دور لے جانے والی ہے جس سے احتراز ضروری ہے۔

خدا کی مرضی ہو تو وہ اپنا دوست بنالے اور تمہیں قرار و اطمینان کی کیفیت سے نواز دے۔ پس چاہیئے کہ اپنے آپ کو اور اسباب مادی کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کا پابند تصور کریں۔ سب کے سب اسی کے ادنیٰ اشارہ کے محتاج ہیں چاہے چیونٹی یا چھوٹے سے چھوٹا کیڑا ہو کہ قوی ہیکل ہاتھی۔ عرش سے فرش تک ہر چیز کی حرکت اسی حی و قیوم کی تابع اور اسی کا ارادہ سارے نظام کائنات پر محیط ہے۔ لہذا اس نکتہ کو گرہ سے باندھ لو اور جان لو کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

خود کو مالک تصور کرنا جہالت ہے۔

ایسی صورت میں تم اپنے آپ کو کس طرح کا شریک ٹھہراتے ہو؟ ذرا اپنے نفس سے پوچھو کہ میں نے تو یہ چاہا تھا لیکن ایسا کیوں نہ ہوا۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ تم اپنے مالک ہونے کے دعویدار ہو حالانکہ نہ تو تمہاری جان، نہ تمہارا مال اور نہ تمہاری اولاد تمہاری ملکیت ہے۔ پس یہ خیال نہ کرو کہ تکلیفیں اٹھا کر دولت جمع کرلینے کے بعد وہ ہمیشہ تمہارے پاس رہے گی۔ چنانچہ جب وہ تمہارا ساتھ چھوڑے تو افسوس کرتے ہو۔ یہ تمہاری جہالت

نہیں تو اور کیا ہے کہ اپنے آپ کو مالک و مختار سمجھ بیٹھے ۔ جو مال اللہ نے عارضی طور پر عنایت فرمایا تھا اسے تم نے بزعم خود اپنا سمجھ لیا ۔ ہاں شرعی حدود میں رہتے ہوئے مالکانہ حقوق جتانا جائز ہے اور ایسا مال محفوظ بھی رہتا ہے ۔ اس کے علاوہ جو مال و دولت ہاتھ آئے وہ حرام ہے جس پر ملکیت کا تمہیں کوئی حق نہیں ۔ احمق نہ بنو اور دھوکہ نہ کھاؤ ۔ اس مغالطہ میں نہ رہو کہ مال و دولت کے حقیقی مالک تم ہی ہو ۔ حقیقی مالک تو اللہ تعالیٰ ہے ۔ محنت کے ذریعے کمائی ہوئی یا ورثہ میں ملی ہوئی دولت پر تمہارا شرعی حق تو ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس کے حقیقی مالک کو فراموش کر بیٹھو اور خود کو اصل مالک خیال کرنے لگو ۔

ماں باپ بھی فی الحقیقت اولاد کے مالک نہیں ۔

اولاد کے تعلق سے حکم یہ ہے کہ اس پر ماں باپ کا حق ہے اسی طرح باپ کا یہ فرض ہے کہ اولاد کے کھانے اور کپڑے کا بندوبست کرے ۔

"وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ"

(سورہ البقرہ ۔ آیت ۲۳۳)

نیز ماں کی یہ ذمہ داری ہے کہ بچہ کو دودھ پلائے ۔

"وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ"

(سورہ ۔ البقرہ آیت ۲۳۳)

لیکن اس گھمنڈ میں نہ رہنا کہ خود کو اپنی اولاد کا رب سمجھنے لگو ۔

تم کہتے ہو کہ میں نے اس کو پال پوس کر بڑا کیا ہے ۔ لیکن تم نے کہاں

سے اس کو بڑا کیا، بڑا تو اس کو خدا نے بزرگ نے کیا ہے۔ہاں تمھیں اس کا ذریعہ بنایا اور تمہاری حیثیت واسطہ سے بڑھکر نہیں ۔ اللہ تعالیٰ ماں باپ کے دلوں میں بچہ کی محبت ڈال دیتا ہے چنانچہ ماں تو اپنی نیندیں حرام کر لیتی ہے اور مصیبتیں اٹھاکر اس کی پرورش کرتی ہے۔ لیکن بچہ کو جو دودھ پلاتی ہے کیا اس کا اپنا پیدا کردہ ہے؟ پھر ماں کے جسم کو کس نے یہ صلاحیت عطا کی ہے کہ وہ اپنا دودھ بچہ کے منہ تک پہنچائے تاکہ اس کا جزو بدن بن جائے؟۔ خدا کی ہستی کے سوا کس نے یہ اہتمام کیا ہے؟ ایسی صورت میں تمہارے لئے اس کا کیا جواز ہے کہ اپنے آپ کو بچہ کا مالک تصور کر لو۔ یہ سراسر بیجا دعویٰ ہے حتیٰ کہ تمہارے لئے بچہ پر اپنا حق جتلانا بھی جائز نہیں۔

میری کیا حقیقت ہے کہ اولاد پر حق اطاعت جتاؤں؟

یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ اپنے والدین کی اطاعت و احترام اور ان سے محبت شرعی احکام کی رو سے اولاد کا فرض ہے لیکن یہ بتلانا مقصود ہے کہ والدین ان کی اطاعت کو اپنا حق نہ گردانیں اور یہ تو سوچیں کہ بھلا میری حقیقت ہی کیا ہے کہ میں اس طرح کا حق جتلاؤں؟

ساتھ ہی اولاد کو بھی یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ماں باپ کی اطاعت اور احترام و تکریم کرتے رہیں اور دل میں ہرگز اس خیال کو جگہ نہ دیں کہ وہ خود بھی کوئی بڑی شے ہیں اس کے برعکس ہمیشہ اپنے آپ کو ان ذرائع میں سے ایک ذریعہ خیال کریں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے والدین کی خدمت کے لئے پیدا کر دیئے ہیں۔

. تقویٰ اور پرہیزگاری پر تسلسل کے ساتھ قائم رہنا چاہیئے۔

اطمینان قلب کے متعلق میں چاہتا ہوں کہ مزید وضاحت کروں تاکہ توحید کے راستہ پر قائم رہنے اور لا الہ الا اللہ پر کامل یقین رکھنے میں انسان طمانیت کے اصل مقام تک پہنچ جائے لیکن یہ بیان کافی طوالت کا مقتضی ہے میں نے اوپر جو آیت شریفہ درج کی ہے اس پر توجہ کے ساتھ غور کریں کہ

"اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ"

(سورہ یونس - آیت ۶۲، ۶۳)

اولیاء اللہ جنہیں نہ کوئی خوف دامنگیر ہوتا ہے اور نہ کسی غم میں مبتلا ہوتے ہیں آخر کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لانے کے بعد تقویٰ کو اپنا شعار بنالیتے ہیں۔ تمام عمر ریاضت کرتے اور زہد و پرہیزگاری پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ جب کوئی لغزش ہو جائے تو فوری استغفار کرتے ہیں تاکہ جادۂ توحید سے انحراف نہ ہونے پائے۔ اور ایمان واثق اور اطمینان کامل کی منزل سے ہمکنار ہوں۔ کیونکہ ولایت کا یہ مقام و مرتبہ جب حاصل ہو جائے تو پھر انہیں نہ تو خدا کے سوا کسی کا خوف ہوتا ہے اور نہ کسی قسم کے غم و اندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔

نفس مطمئنہ خوف اور غم واندوہ سے بچا رہتا ہے۔

اگر ان کے کام بنتے نظر نہ آئیں تو وہ رنجیدہ اور ملول نہیں ہوتے۔ اولاد مر جائے پھر بھی انہیں پرواہ نہیں ہوتی۔ مال چلا جائے تو کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ صبر و شکر کا مظاہرہ کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ جس کا دیا ہوا تھا اس نے واپس لے لیا۔ جس نے جان دی تھی اسی کے حکم سے واپس لے لی گئی۔ پھر غم کس بات کا؟ اس کی مصلحت میں ہمیشہ خیر کا پہلو ہوتا ہے پس وہ حزن و ملال اور غم واندوہ کو دل میں جگہ نہیں دیتے کہ اس کی مصلحت سے روگردانی نہ ہونے پائے۔

"میں اور میری آزادی و خود مختاری" کا راگ الاپنا چھوڑ دو۔ اور یہ کہو کہ "میں تو بندہ ہوں اور میرے سب کام میرے مالک کے اختیار میں ہیں۔ میری روزی کس کے اختیار میں ہے؟ کیا میرے مال اور میری تجارت میرے رزق کا ذریعہ ہیں؟ اگر میں ایسا خیال کروں تو کافر ہو جاؤنگا۔ کیونکہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے وہی میرا روزی رساں ہے۔ دنیا میں جب تک زندہ ہوں میری روزی اسی کے ذمہ ہے اور جب یہاں سے رخصت ہو جاؤنگا تو اس وقت بھی اسی کے رحم و کرم کا محتاج رہونگا۔ اس دنیا کا رزق اور بعد از مرگ عالم برزخ میں بھی مجھے رزق پہنچانے والا وہی ہے۔ وہی تو ہے جو ہر عالم کی مناسبت سے رزق بہم پہنچاتا ہے اور اسی نے مجھے پیدا کیا ہے۔"

بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ

(سورہ آل عمران۔ آیت ۱۶۹)

اولیاء اللہ کو آئندہ پیش آنے والے واقعات کا بھی خوف دامنگیر نہیں ہوتا۔

اولیاء اللہ کو آئندہ پیش آنے والے واقعات کا بھی خوف نہیں ہوتا۔ نہ تو ان کا ماضی انہیں بدحال کرتا ہے اور نہ ہی آئندہ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں وہ خوفزدہ رہتے ہیں۔ مستقبل میں جو کچھ بھی ان پر گزرنے والا ہو اس کی فکر اس لئے لاحق نہیں ہوتی کہ نہ معلوم کل تک وہ زندہ بھی رہیں گے یا نہیں۔ پھر کل کے بارے میں فکر کرنے اور پریشان ہونے سے کیا حاصل۔ مستقبل کا حال تو معلوم نہیں۔ پس ہرچہ بادا باد کہکر صبر سے کام لینا چاہیئے۔

یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ لوگ آئندہ سال بھر میں پیش آنے والے واقعات کی فکر میں اپنی جانیں کھپاتے ہیں حالانکہ انہیں یہ بھی خبر نہیں کہ ایک ہفتہ کے اندر کیا کچھ رونما ہو سکتا ہے۔

لیکن جو شخص اولیاء اللہ کے زمرہ میں شامل ہو جائے اور نفس مطمئنہ کے مقام پر فائز ہو جائے وہ اپنے مستقبل کی فکر سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ پیش آنے والا ہے اس پر اسے کوئی اختیار نہیں اور نہ اس کو اپنا حق خیال کرتا ہے۔ بلکہ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اے خداوند۔ میرا مقدر، میری زندگی اور میرا سب کچھ تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں تو تیرا بندہ ہوں اور تو جو سلوک بھی میرے ساتھ کرنا چاہے اس کا تجھے پورا اختیار ہے۔ اگر میری زندگی کا کچھ حصہ باقی ہے تو اس کے لئے اسباب اور سامان حیات مہیا کرنا بھی تیرے ذمہ ہے۔ میں اپنے آپ کو تنہا خیال نہیں کرتا

کیونکہ تو میرا ولی اور سرپرست ہے۔

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

(سورہ البقرۃ - آیت ۲۵۷)

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ مَوْلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْکَافِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَھُمْ

(سورہ محمد - آیت ۱۱)

اور تجھ سا بزرگ اور قوی جس کا سرپرست ہو، اسے کس چیز کا خوف یا اندیشہ ہو سکتا ہے نہ تو اسباب دنیوی سے محرومی کا غم اور نہ اپنے مستقبل کی فکر۔ میں نے تیرے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے اور تیرے سوا نہ تو کوئی دوسرا آقا ہے اور نہ میں خود اپنا مالک ہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے فرزند ابراہیم کی موت پر گریہ کناں ہونا۔

اولیاء اللہ کا یہ کام نہیں کہ وہ اپنی کسی چیز کے کھو جانے پر حزن و ملال کا اظہار کریں۔ کوئی اگر پوچھے کہ پیمبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ علیہم السلام کے حزن و ملال کا کیا جواز ہے۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے فرزند حضرت ابراہیم علیہ السلام کی موت پر آنسو بہائے تھے نیز حضرت حسین علیہ السلام نے بھی تو اپنے جگر گوشہ کو گود میں اٹھا لیا تھا اور اسے پیار کر کے رونے لگے تھے یہ غم و اندوہ کا اظہار نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو خدا کے بندوں کے عمل کو اپنے عمل پر قیاس نہیں

کرنا چاہیئے ۔ ہمارا اور تمہارا اظہار مسرت والم ہمارے نفس کی خواہش کا تابع ہوتا ہے کہ ہائے میرا بچہ کیسے مرگیا؟ اس کی موت کیوں واقع ہوگئی؟ اسی رنج و غم کے عالم میں ہم پر غیظ و غضب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور خدا پر اعتراض کرنا شروع کر دیتے ہیں ۔ یہاں تک کہ بعض جاہل لوگ اپنے عزیزوں کی موت پر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں اور ان کی حرکتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ان کا بس چلے تو حضرت عزرائیلؑ کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیں ۔ کہ تم نے میرے بچہ کو کیوں مار ڈالا؟ غرض یہ کہ اپنی جہالت اور اپنی انانیت کے اظہار میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے ۔

لیکن اولیاء اللہ کا طریقہ بالکل دوسرا ہے ۔ جب کبھی اللہ تعالیٰ ان کی موت کا حکم دیتا ہے وہ ہنسی خوشی اپنے آپ کو موت کے سپرد کر دیتے ہیں ۔ بقول شاعر ۔

این جان عاریت کہ بحافظ سپردہ دوست
روزے رخش بہ بینم و تسلیم وے کنم

شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ میری جان تو میری ملکیت نہ تھی ۔ اسی نے دی تھی اسی نے لے لی ۔ جب اپنی جان کے بارے میں یہ تصور ہو تو پھر اولاد اور دوسرے اعزا واقارب کے مرنے پر کیا غم ہو سکتا ہے ۔ کیونکہ "یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ" وہی ہے ۔

رحمت الہیٰ کی طلب نہ کہ نفسانیت

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے فرزند ابراہیم کی موت پر رونا اس غرض سے ہے کہ رحمت الہیٰ کا نزول ہو نہ کہ ہوائے نفس یا قضا و قدر کے

امور پر اعتراض کا مظہر۔

اسی طرح عاشورہ کے دن امام حسینؑ کا عمل رحمت الہیٰ کے طلب گار ہونے سے عبارت ہے۔ یہاں تک کہ اس دن حسینؑ کو جو کوئی دیکھتا اس کے دل میں رحم کا جذبہ خود بخود بیدار ہو جاتا اور سب سے بڑا رحم کرنے والا تو پروردگار عالم ہے پس رحمت الہیٰ کی طلب مقصود تھی نہ کہ اپنے نفس کی خواہش کا اظہار اور حکم خداوندی کی بلا چون وچرا تعمیل ہی کا ایک طریقہ جس میں ہوائے نفس کا کوئی دخل نہ تھا۔

امام حسینؑ کے آخری بار رونے اور نوحہ کرنے کی حقیقت۔

شیخ شوستری نے امام حسینؑ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھا کہ حسینؑ عاشورہ کے دن چھ بار روئے اور یہ کہ چھ مرتبہ بھی جب حسینؑ روئے ہیں تو اللہ سے رحم کے طلب گار ہو کر ہی روئے ہیں کہ خدائے تعالیٰ اپنی رحمت نازل فرمائے اور اسی عالم میں ان کے آنسو رواں تھے۔

آخری بار وہ اس وقت روئے جبکہ ان کی صاحبزادی سکینہؑ اپنا چہرہ باپ کے پاؤں پر رکھکر زار و قطار رونے لگیں۔ یہ منظر بڑا ہی دلخراش تھا۔ حسینؑ نے اپنی بیٹی کو گود میں لیا۔ دست شفقت سے سکینہؑ کے چہرہ اور سر کو سہلاتے رہے اور ایک شعر پڑھا۔

لا تحر فی قلبی بد معک حسرۃ
مادام منی الروح فی جسمانی

اے میری بیٹی اپنے آنسوؤں سے میرے دل کی آگ تیز نہ کر کہ میں ابھی زندہ ہوں۔

باب ششم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

يَا اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ

(سورہ الفجر۔ آیت ۲۷ تا ۳۰)

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ نَفْسِيْ مُطْمَئِنَّةً بِقَدَرِكَ رَاضِيَةً بِقَضَائِكَ مُوْلَعَةً بِذِكْرِكَ وَ دُعَائِكَ مُحِبَّةً لِصَفْوَةِ اَوْلِيَائِكَ مَحْبُوْبَةً فِيْ اَرْضِكَ وَسَمَائِكَ صَابِرَةً عَلٰى نُزُوْلِ بَلَائِكَ شَاكِرَةً لِفَوَاضِلِ نَعْمَائِكَ۔

ارواح عالیہ کے ساتھ اتصال

ہم نے سورہ الفجر کی مذکورہ آیت کی تفسیر کافی شرح و بسط کے ساتھ بیان کردی اور واضح کرنے کی کوشش کی کہ انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتب کے نزول کا اصل مقصد انسان کو اس مقام تک پہنچنے کا راستہ دکھانا ہے جو اطمینان قلب اور تسلیم و رضا کا مقام ہے اور کسی بھی بشر کے لئے بلند ترین اور اعلیٰ ترین مرتبہ کا حامل ہے۔ اور جب وہ اس مقام کو پالیتا ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت کی ارواح عالیہ کے ساتھ متصل ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں مزید وضاحت کی خاطر زیارت شریف امین اللہ کی جانب متوجہ ہونے کی ضرورت ہے تاکہ حقیقی معنوں میں نفس مطمئنہ کا

مفہوم واضح ہوسکے۔

زیارت امین اللہ نہایت اہم بھی ہے اور جامع بھی۔

سب سے پہلے تو یہ دعا مانگو کہ "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ نَفْسِیْ مُطْمَئِنَّۃً بِقَدْرِکَ" اور ہر چند کہ زیارت امین اللہ اسی کے بقدر اور بہت ہی مختصر ہے لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ اس کا شمار سب سے معتبر اور جامع زیارات میں ہوتا ہے۔

مؤمنین میں سے ایک شخص نے سوال کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ زیارت امین اللہ کی دعا اپنی ضخامت میں ایک صفحہ سے بھی زیادہ پر مشتمل نہیں لیکن اپنے اوصاف اور فضائل کے اعتبار سے اسے سب پر فضیلت حاصل ہے؟

اس کے جواب میں عرض کرتا ہوں کہ وہ کمیت میں تو کم ہے لیکن کیفیت میں بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس زیارت شریفہ کو قلمبند کرکے مقامات عالیہ کا طالب ہو تو وہ معنوی اعتبار سے بے شمار نعمتوں سے نوازا جائے گا۔

زیارت امین اللہ کی تفصیل۔

جو شخص امام کو "امین اللہ" کی حیثیت سے پہچان لے گا تو اس کے لئے وہی کافی ہوگا۔ شرط یہ ہے کہ پورے یقین اور اعتقاد کے ساتھ امام سے مخاطب ہو کر یوں عرض کرے۔

"آپ تو خدائی خزانوں کے مالک ہیں۔ اس دنیا میں ہر شخص کو جو کچھ

بھی ملتا ہے وہ آپ ہی کے واسطے سے ملتا ہے۔" یہ صرف زبان سے نہ کہے بلکہ دل میں بھی اس پر کامل یقین ہو۔

بعدازاں یہ الفاظ کہے جائیں۔

"اَشْهَدُ اَنَّكَ جَاهَدْتَ فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ" یعنی میں گواہی دیتا ہوں اس بات کی کہ آپ نے خدا کی راہ میں اس طرح جہاد کیا کہ جیسا کہ اس کا حق تھا۔ گویا آپ نے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق عمل کیا۔

مجھے دراصل کیفی اعتبار سے اس زیارت کی اہمیت دکھانا مقصود ہے۔ حضور قلب اور عقیدہ راسخ کے ساتھ اتنا بھی کر لیا جائے تو کافی ہے ویسے اس کے فضائل ومطالب کی تفصیل تو خاصی طویل ہے۔

اولین شرط تو قلب کا اطمینان ہے۔

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ نَفْسِيْ مُطْمَئِنَّةً بِقَدَرِكَ"

اے خدا۔ اپنی قدرت بے پایاں سے میرے نفس کو اطمینان عطا فرما۔ اگر بلند تر مرتبہ چاہتا ہے تو وہ مقام، سلمان محمدیؓ اور ابوذر غفاریؓ کا ہے جو نفس الٰہی اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وآل محمد علیہم السلام سے اتصال کا مقام ہے۔

اس آیہ شریفہ میں نفس کا لفظ روح سے عبارت ہے۔ کیونکہ انسان کا جسم اسی کے زیر نگین ہے۔ اور یہ جسد خاکی دراصل اسی کی کارفرمائی اور اسی کے احکام کی تکمیل کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ یہ بات نہیں کہ یَآ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ میں نفس سے مراد انسان کا یہی پیکر ہو جیسا کہ ہم کہتے ہیں۔ میں آیا

"میں گیا" "میں نے یہ کام کیا" وغیرہ - بلکہ یہاں نفس کا مطلب ہے کہ انسان کی اصل حقیقت یعنی اس کی ذات مراد ہے نہ کہ اس کا بدن -

پھر مطمئنہ کے معنی ہیں قرار و سکون - جو اضطراب اور بے چینی کی ضد ہے چنانچہ جب تک انسان کو اطمینان میسر نہیں آتا وہ بے قراری اور اضطراب میں پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے - لیکن آخر اس اضطراب کا سبب کیا ہے؟

دنیوی اسباب پر بھروسہ اضطراب کی اصل وجہ ہے-

آدمی کو جب تک خدا کی پہچان نہ ہو اور یقین کے مقام تک اس کی رسائی نہ ہو اس کا دل اضطراب ہی کا شکار ہوگا - وہ ظاہری اسباب پر تکیہ کرتا رہے گا - اور زندگی کو اپنے کندھوں پر ایک بوجھ کی طرح اٹھائے پھرے گا - مثلاً تمہارے مشاہدہ میں یہ بات بھی آتی ہے کہ بعض طالب علم اپنا سبق تو پڑھتے اور یاد کرتے رہتے ہیں اور حصول علم کے لئے بڑی مشقت اٹھاتے ہیں تاکہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جائیں بلکہ بڑی بڑی ڈگریاں حتیٰ کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کر لیں لیکن جب یہ ڈگری ان کے ہاتھ میں آجاتی ہے اور کسی ادارہ میں انہیں ملازمت مل جاتی ہے تو پھر اپنے حقوق کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور بے چینی و اضطراب سے پیچھا نہیں چھوٹتا کیونکہ ان کے خیال میں انہیں جو کچھ ملا ہے وہ ان کی ڈگری کے شایان شان نہیں یا ایک صراف اور جوہری کو دیکھو کہ اسے ہر وقت یہی اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کب اسے گھاٹا ہو جائے اور اسی فکر میں رہتا ہے کہ فلاں سودا کروں یا نہ کروں - غرضیکہ سب ہی لوگ اسی قسم کے اضطراب کا شکار ہوتے رہتے ہیں - حالانکہ لا الہ الا

اللہ کا کلمہ وردِ زبان ہوتا ہے اور قرآن مجید کی تلاوت بھی کرتے ہیں اور زبان سے بھی کہتے ہیں کہ سارے کاموں کا اختیار اللہ تعالیٰ ہی کو ہے لیکن دل میں اس پر کامل یقین نہیں ہوتا اس لئے پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اسباب دنیوی ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ کہتے تو ہیں کہ خدا ہی رب اور پالنے والا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں سارا انتظام ہے اور وہی مدبر الامر ہے۔ لیکن حال یہ ہے کہ کفر ہی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ خود اپنی زندگی کو بوجھ خیال کرتے ہیں۔ زعم یہ ہے کہ دنیوی اسباب ہی کے بل بوتے پر وہ سارے امور کو انجام دے سکتے ہیں اپنے آپ کو اور سارے بنی نوع انسان کو مستقل بالذات خود مختار اور ہر کام کے سلسلہ میں آزاد تصور کرتے ہیں اور جب اسباب ان کا ساتھ نہ دیں اور خود کو بے یار و مددگار اور بے سہارا محسوس کریں تو پھر انہیں پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ کیونکہ دنیوی اسباب تو ان کی مرضی کے تابع ہوتے ہیں اور نہ ان کے حسب دل خواہ ہر چیز واقع ہو سکتی ہے بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مفقودہ اسباب اور وسائل کی تلاش ہی میں سرگرداں رہتے ہیں اور جب اسباب و وسائل ان کے ہاتھ نہیں آتے تو مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مال اور اولاد پر بھروسہ حقیقی کفر کی علامت ہے۔

اب ایک اور شخص کی مثال لو۔ اس کے ہاں مال و دولت کی افراط ہے اور وہ اپنے تئیں اس گھمنڈ میں مبتلا رہتا ہے کہ اس طرح خوش حالی کی زندگی بسر ہوتی رہے گی۔ لیکن اس دنیا میں ایک نہ ایک دن تو زوال آتا ہی ہے اور اسکی دولت کو بھی کسی نہ کسی دن تو ختم ہونا ہی ہے۔ لیکن وہ جونہی اس

حال کو پہنچتا ہے، غم و اندوہ اور حزن و ملال سے بے حال ہو جاتا ہے۔ اب تم دیکھو کہ اس کی وہی فرشتوں جیسی صورت پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں اور اس کے چہرے کو کفر کی تاریکی نے ڈھانک لیا ہوگا۔ یہ محض اس لئے کہ غیب پر اس کا ایمان نہیں ہوتا اور یہ سمجھتا ہے کہ مال و دولت ہاتھ سے چلی گئی تو سب کچھ جاتا رہا۔

ایک دوسرے شخص کی مثال ایسی ہے کہ جس نے اپنے بیٹے کو پال پوس کر پروان چڑھایا اور اس امید پر کہ جب وہ بوڑھا ہو جائے گا تو بیٹا اس کے لئے بڑھاپے کا سہارا ثابت ہوگا۔ لیکن بیٹے کے مر جانے پر تو اس کا امن و سکون ہی غائب ہو جاتا ہے۔ چونکہ خدا شناس نہ تھا اور اس کی قدرت پر بھروسہ نہ تھا لہذا گریہ وزاری اور بے تابی و بے صبری کا اظہار کرنے لگتا ہے

خودکشی بھی نفس کی بے اطمینانی و بے چینی کا اظہار ہے۔

کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ آدمی اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالتا ہے تو اسے مایوسی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ نیز سارے اسباب اور وسائل مفقود ہو جاتے ہیں اور امید کی جھلک بھی نہیں دکھائی دیتی۔ اس صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر وہ خودکشی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ جب کسی نوجوان کو روزگار نہیں ملتا تو اپنا گلا گھونٹ لیتا ہے اور زندگی کا بوجھ سنبھالنے کے لئے اس کے خیال میں یہی واحد ذریعہ ہو سکتا تھا اور چونکہ وہ اس سے محروم ہو گیا ہے لہذا امید کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتا ہے خدا کی رحمتوں اور فضل و کرم سے ناامیدی ایمان کے تزلزل اور بے اطمینانی

کا باعث بنتی ہے اور یہ صریح کفر ہے۔

"قَدْ يَئِسُوا مِنَ الْآخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ أَصْحٰبِ الْقُبُورِ"

(سورہ الممتحنہ - آیت ۱۳)

ولی اللہ کی قبر پر پہنچ کر اطمینان قلب کی دعا مانگنا۔

غرضیکہ اوپر جتنی مثالیں ہم نے بیان کی ہیں وہ سب بے صبری بے یقینی اور اضطراب و پریشانی کی ہیں کہ ایمان کے بغیر آدمی کو اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت تو ایمان کامل ہی ہے۔ پس خدائے تعالیٰ سے جو چیز مانگنی ہے بھی اطمینان قلب ہے یعنی "اللھم اجعل نفسی مطمئنۃ بقدرک" اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس طرح دعا کرے کہ خداوندا میں تیرے ولی کی قبر پر حاضر ہوا ہوں اور تجھ سے اطمینان قلب کی نعمت کا طالب ہوں اور پھر یہ کہے کہ اے امین خدا اے خزانہ دار خدا آپ کا واسطہ درکار ہے۔

پس جس وقت تک اطمینان نفس حاصل نہ ہو جائے وہ کفر ہی کی حالت میں ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان کا بھروسہ اسباب پر ہوتا ہے نہ کہ مسبب الاسباب پر جب آدمی اپنے پروردگار پر بھروسہ کرنے لگے تو تمام ظاہری اسباب کے فقدان کے باوجود اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا اس لئے اس کا مولا اور سرپرست تو خدا ہوتا ہے لہذا اس کا امن و سکون کوئی نہیں چھین سکتا۔

"ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَأَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ"

(سورہ محمد - آیت ۱۱)

میرے مولا کے خزانے دولت سے بھرے ہوئے ہیں اور کبھی خالی نہیں ہوتے۔

اب ہم اوپر بیان کردہ مفہوم کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کرینگے۔
کسی شہر میں ایک مالدار شخص رہتا تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ وہاں سخت قحط پڑا جس سے سارے لوگ غیر معمولی مصائب و آلام میں مبتلا ہو گئے۔
(خدا کرے کہ ہم کسی ایسے قحط سے دوچار نہ ہوں۔ ابھی حال کی بات ہے کہ دوسری عالمی جنگ میں جو کچھ ہم پر گزری وہ ہم کیسے فراموش کر سکتے ہیں)
وہ بیان کرتا ہے کہ شہر میں لوگ ہر طرف پریشان تھے اور واویلا مچا ہوا تھا لیکن اس نے ایک غلام کو دیکھا کہ وہ ہنسی خوشی اور ہر طرح کی فکر سے آزاد اپنے کام میں ہمہ تن منہمک ہے۔
اس شخص نے غلام سے دریافت کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ ساری خلقت تو سراسیمگی اور اضطراب کا شکار ہے اور تو خوش و خرم دکھائی دے رہا ہے غلام نے جواب دیا کہ میرے آقا کے پاس تو دولت کے انبار لگے ہیں پھر کس بات کا غم ہو سکتا ہے۔ میرے مالک کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔
وہ بیان کرتا ہے کہ غلام کی اس بات نے مجھ پر بڑا اثر کیا اسے اپنے مالک اور آقا کی ظاہری دولت و قوت پر اتنا بھروسہ تھا کہ ہر طرح کی پریشانی اور فکر سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ کاش کہ میں بھی اپنے حقیقی مالک و آقا پر بھروسہ کرتا اور یہ کہنے کے قابل ہوتا کہ میرے ساتھ خدا ہے۔ پھر مجھے کس چیز کی حاجت ہے کیونکہ میرے خدا کے خزانے تو ہمیشہ بھرے رہتے ہیں اور

کبھی ختم نہیں ہوتے ۔ دولت ہاتھ سے جاتی رہے تو میں کہہ سکوں کہ میری اصل دولت تو خدا پر بھروسہ اور توکل ہے ۔ جب خدا میرا کارساز ہے تو اسکے آگے میری طاقت و قوت کس شمار میں آسکتی ہے ۔

خدا تو اولاد کا بھی ہوتا ہے ۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی کثیر العیالی سے تنگ آجاتا ہے اور کہتا ہے کہ میری زندگی تو عذاب بن گئی ہے ۔ دس افراد کھانے والے ہیں اور سب کا بار میرے دوش ناتواں پر ہے ۔ لیکن وہ بھول جاتا ہے کہ بچے اور اولاد بھی خدا کی دین ہیں اور جس طرح تیری ذات کا مالک خدا ہے ان کا مالک بھی خدا ہے ۔ کیونکہ جس نے منہ اور دانت دیئے ہیں وہی ان کو روٹی بہم پہنچاتا ہے ۔

پھر اسے یہ غم بھی کھائے جاتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اولاد کا کیا بنے گا اور ان کی پرورش کیسے ہوگی ۔ لیکن جس طرح خدا اس کا کارساز ہے اس کی اولاد کا بھی وہی کارساز ہے ۔ پس چاہیئے کہ دل میں ایسے خیالات کو جگہ نہ دے اور غمگین نہ ہو ۔ مادی اسباب سے امید لگائے رکھنا اور خوف اور مایوسی کا شکار ہو جانا کفر کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ اس طرح وہ خدا سے دور ہو جاتا ہے ۔

سب کا پالنے والا خدا ہے ۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق اور کارساز حقیقی ہونے پر جس قدر زور دیا گیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے ایمان کی سلامتی کی دعا کرتے رہیں کیونکہ اصل کار فرمائی اسی کی ہے اور غیر خدا کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ۔

میں اور تو اور سارے بنی نوع انسان سب کے سب پانی کی ایک حقیر بوند سے زیادہ کچھ نہ تھے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ہمیں یہ مقام عطا فرمایا۔ جب تک شیر خوارگی کے عالم میں رہے تو فضل و کرم شامل تھا جس نے ماں باپ کو ہماری خدمت اور پذیرائی پر مامور کر دیا۔ گہوارہ میں تھے تو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا بھی ممکن نہ تھا لیکن اب یہ گھمنڈ ہے کہ ہم آزاد و خود مختار ہیں۔ یہ اختیار کہاں سے مل گیا؟ حالانکہ رزق دینے والا خداوند کریم ہی ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ روئے زمین پر اپنے قدموں سے چلنے والی کوئی مخلوق ایسی نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔

"وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا".

(سورہ ہود۔ آیت ۶)

ہماری زندگی بھی اس وقت تک ہے جب تک اس کی مشیت چاہے اور جب تک ہم زندہ ہیں وہی ہمارا روزی رساں ہے۔

ہاں یہ سچ ہے کہ اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کا تقاضا یہ تھا کہ ہمیں کام کرنے اور کمانے کی صلاحیت عطا فرما دے۔ چنانچہ کھیتی باڑی بھی کرتے ہیں اور گلہ بانی بھی کرتے ہیں اور دوسرے بہت سے پیشوں سے منسلک ہیں۔ تاہم تمہاری زندگی کا دار و مدار اس پر نہیں۔ زندگی تو دراصل اسی کے رحم و کرم کی محتاج ہے۔ پس اسباب دنیوی کی کمی بیشی پر تمہیں دل برداشتہ اور پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

کل تک زندہ رہو گے تو کل بھی رزق دینے والا وہی ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کے لئے معاویہ نے چالیس اشرفیاں

روانہ کیں تاکہ انہیں علیؑ کی مخالفت پر آمادہ کیا جا سکے ۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے مٹی کے ایک برتن کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ جب تک اس برتن میں جو کچھ بھی باقی ہے میں بے نیاز ہوں ۔ اس برتن میں دو روٹیاں رکھی تھیں فرمایا کہ ایک تو آج میرا روزہ افطار کرنے کے لئے ہے اور دوسری کل کے روزہ کے لئے سحری کے لئے کافی ہے ۔ اور اگر میری عمر کا کچھ حصہ باقی ہے اور کل بھی زندہ رہ جاؤں تو خدا میری روزی پہنچانے والا ہے ۔ لیکن کل کا تو علم نہیں ۔ نہ معلوم میں زندہ بھی رہوں کہ نہیں ۔ پھر غم کس چیز کا اور فکر کس بات کی ؟ جو ہستی آج تک میرے رزق کا بندوبست کرتی رہی ہے ۔ باقی عمر بھی وہی رزق پہنچاتا رہے گا ۔ یقین کرو کہ مجھے خدا کے سوا کسی اور ہستی یا کسی چیز کی حاجت نہیں ۔

"یَا اَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ"

(سورہ فاطر ۔ آیت ۱۵)

اس کے سوا ساری مخلوق، امیر و فقیر، شاہ و گدا، سب اس کے محتاج ہیں ۔ وہ ایسا کارساز ہے چاہے تو کسی ذریعے یا واسطہ کے بغیر بھی تمہاری حاجت روا کر سکتا ہے ۔

ایک موحد مومن کا کنوئیں میں گرنا اور امداد غیبی سے اس کا صحیح سالم باہر نکل آنا ۔

کیا تم نے اس مرد خدا کا قصہ بھی سنا ہے ؟ جو ایک اندھیری رات کو کسی جنگل میں سفر کر رہا تھا کہ ناگہاں ایک کنوئیں میں گر پڑا ۔ اتفاقاً ایک اور مسافر

کا اس طرف سے گزر ہوا۔ اس نے سوچا کہ کنوئیں میں کوئی گر نہ جائے ایک بڑا پتھر اٹھا کر اس کنوئیں پر رکھ دیا اور کنوئیں کا منھ بند کر دیا۔

لیکن وہ مرد خدا جو کنوئیں میں گر چکا تھا اپنے کارساز حقیقی سے امید لگائے ہوئے تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اگر اس کی زندگی باقی ہے اور ابھی اس کی موت کا وقت نہیں آیا تو اللہ تعالیٰ یقیناً اسے اس مصیبت سے نجات دلا دیگا۔ وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ کنوئیں کے بالائی سرے سے مٹی اس کے سر پر گرنے لگی۔ اب جو اس نے اوپر کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ کسی جانور کی دم سی لٹکتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور اس دم کو پکڑ کر اوپر چڑھتا ہوا صحیح سالم کنوئیں سے باہر نکل آیا۔

چونکہ خدا کی مرضی تھی کہ اسے کنوئیں کی گہرائی سے زندہ سلامت باہر نکال لے لہذا اس کی مشیت نے جس طرح چاہا اس کے لئے ذریعہ اور وسیلہ مہیا کر دیا اور اس کو بچا لیا۔ لیکن اگر خدا کی مرضی نہ ہوتی تو ہزاروں جتن کرنے کے باوجود وہ باہر نہ نکل سکتا تھا۔

اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف دامن گیر ہوتا ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔

اس کارخانہ ہستی کا سارا انتظام خدا ہی کے ہاتھ میں ہے وہی مدبر عالم اور کارساز حقیقی ہے۔ کائنات کا ایک ایک ذرہ اسی کے زیر نگین اور اسی کے حکم کے تابع ہے۔

یہاں مجھے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ انسان کو اسباب دنیوی کے

فقدان اور وسائل زندگی سے محرومی کا خوف ہو تو وہ اولیاء اللہ کے زمرہ میں ہرگز شامل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اولیاء اللہ کو نہ تو اسباب کے زائل ہونے کا خطرہ ہوتا ہے اور نہ ان پر کوئی افتاد پڑے تو وہ اس سے غمگین و محزون ہوتے ہیں۔

"اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ"

(سورہ یونس۔ آیت ۶۲)

اولیاء اللہ کا قول تو "رَاضِيَةً بِقَضَآئِكَ" ہوتا ہے یعنی خدا کی مرضی پر سر تسلیم خم۔ اگر اس کی مصلحت کا تقاضا یہی ہو کہ مجھے کسی مصیبت یا آزمائش میں مبتلا کر دے تو اس میں میری بھلائی ہے اور اگر اس کی مصلحت نہ ہو تو کوئی مصیبت بھی مجھ پر نازل نہیں ہو سکتی۔ لہذا مجھے نہ تو اپنے ماضی میں گزرے ہوئے واقعات کا افسوس ہے اور نہ آنے والے مصائب کا خوف۔ جس بات سے عام لوگ خائف رہتے ہیں میرے لئے خدا اسی بات کو پسند فرمائے تو اسی میں میری بھلائی ہوگی۔ پھر مجھے پریشان اور غمگین ہونے کی کیا ضرورت ہے، کیونکہ وہ نہ چاہے گا تو مجھ پر کوئی مصیبت نہ آئے گی۔

حسینؑ اور زینبؑ اطمینان قلب کے کامل نمونے ہیں۔

حسینؑ یہ جانتے تھے کہ وہ مکہ سے جونہی روانہ ہونگے انہیں گرفتار کر لیا جائے گا اور بڑے مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن مدارج عالیہ پر فائز کیا جانا مقصود تھا اور ان کی بھلائی اور خدا کی مصلحت اسی میں تھی پس انہوں نے یہ صعوبتیں برداشت کرنے کی ٹھان لی۔

حسینؑ تو نفس مطمئنہ کے پیکر تھے۔ چونکہ سکون و آرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے لہذا راضی برضائے الٰہی ہوتے ہوئے قضا و قدر کے فیصلہ کے آگے انہوں نے سر جھکا دیا۔

زینبؑ نے اس دشوار گزار سفر میں اپنے آرام کا خیال نہ کیا بلکہ خواتین اور بچوں کے آرام کا بندوبست کرتی رہیں۔ ایمان اور نفس مطمئنہ کا بھی کچھ تقاضا تھا چنانچہ زینبؑ کے حالات میں وہ تمام تفصیلات ملتی ہیں کہ کوفہ کے بازاروں ابن زیاد کی محفل اور یزید کے دربار میں ان پر کیا کچھ نہ بیتی۔ اور ان سے کیسا سلوک کیا گیا جو ان کے شایان شان نہ تھا۔

شیعہ تو پہاڑ کی طرح مضبوط ہوتے ہیں۔

تاہم مومن پہاڑ کی طرح مضبوط ہوتے ہیں۔ حوادثات اور مصائب ان کے عزم کو نہ متزلزل کر سکتے ہیں اور نہ ہی وہ جھکتے ہیں۔ خدایا ہمیں بھی نفس کا اطمینان عطا فرما اور تسلیم و رضا کے مقام پر فائز فرما۔ اور ہمیں بھی اہل بیت کے شیعوں کے زمرہ میں شامل فرما۔

لیکن یاد رکھو کہ ہمارے اور ان کے مابین فاصلہ طویل ہے۔ آزمائش کے وقت پر ہی یہ معلوم ہو سکے گا کہ ہم ظاہری و دنیوی اسباب کو کس قدر اہم سمجھتے اور ماسوا اللہ پر ہمارا کتنا بھروسہ ہے۔

اولیاء اللہ کے ظاہری اسباب جو مفقود ہو جاتے ہیں تو ان کے لئے بھی یہ امتحان کا موقع ہوتا ہے چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ امتحان میں پورے اترے اور خدا نے انہیں اپنا دوست بنا لیا۔ اگر تم سلمان فارسیؓ اور حبیب بن مظاہرؓ کے مقام تک رسائی حاصل کرنا چاہتے

ہو تو اپنے خدا پر بھروسہ کرو اور دیکھو کہ آیا تمہیں طمانیت قلب حاصل ہے یا ہنوز اپنے آپ کو با اختیار سمجھ کر پریشانی میں بستلا ہو نیز خدائے واحد کو چھوڑ کر تم نے اپنے لئے ہزاروں مولا بنا لیئے ہیں۔ تم اپنے آپ کو بندہ نہیں سمجھتے اس لئے قضا و قدر کے فیصلوں کو بے چون وچرا قبول نہیں کرتے اور اسلئے ان پر معترض ہوتے ہو۔

خدا جو کچھ چاہتا ہے اس کو خوشی سے قبول کرنا ہی رضا و تسلیم ہے

چنانچہ رضا و تسلیم کے معنوں میں فرمایا گیا ہے کہ اعتراض اور شک و شبہ کو دل میں جگہ نہ دینا ہی تسلیم و رضا ہے یعنی جس حال میں بھی رہیں اور جو کچھ بھی بیتے اس پر صبر و شکر کا اظہار کرو اور یہ سمجھ کر اسے قبول کر لینا کہ میرے پروردگار کی مصلحت یہی ہے اور اسی میں میری بھلائی ہے۔

زیارت امین اللہ کے بارے میں ہمیں چاہیئے کہ سارے اماموں کا واسطہ دیکر یہ دعا مانگیں کہ اللہ ہمیں اطمینان قلب نصیب کر اور مشیت کے فیصلوں پر سر تسلیم خم کرنے کی توفیق عطا فرما۔ "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ نَفْسِیْ مُطْمَئِنَّۃً بِقَدَرِکَ رَاضِیَۃً بِقَضَائِکَ"

نیز اہل بیت کے وسیلہ سے نعمتوں اور خاص طور پر مرتے وقت سکون کی موت کے طلب گار رہیں اس خیال سے غمگین اور پریشان نہ ہوں کہ اس دنیا سے جا رہے ہو۔ تمہارا رازق یہاں بھی خدا ہی ہے۔ برزخ میں بھی وہی رزق عطا کرے گا اور قیامت کے دن کا رازق بھی وہی ہو گا۔

جنازہ اٹھے تو اس طرح دعا کی جائے کہ خداوندا یہ تیرا بندہ ہے اور

تیرے بندے ہی کا بیٹا ہے - اب تیری بارگاہ میں حاضر ہو رہا ہے - تاہم مرنے والا خود بھی مرنے سے پہلے اسی قسم کی دعا مانگتا رہے تو اس کی تاثیر اور بھی زیادہ ہو گی بشرطیکہ یہ یقین رکھے کہ مالک الملک کے الطاف و اکرام اور رحمت خداوندی کے زیر سایہ اس کی رسائی ہو رہی ہے -

---

باب ہفتم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي.

اپنے نفس کی خواہشات سے باز آجاؤ اور خدا کی طرف سے جو مل جائے اس پر قناعت کرو

ہم نے جو آیات قرآنی اور عقلی دلائل پیش کیے ہیں ان کا حاصل یہی ہے کہ خدا نے انسان کو بندگی اور عبودیت ہی کے لئے پیدا کیا ہے بلکہ ہر آدمی کی فطرت میں بندگی کا پہلو مضمر ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اسے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں چاہے وہ ہوا و ہوس کا بندہ بن جائے۔ چاہے وہ اپنے خالق کی بندگی اختیار کرلے۔

حیوانات کا مالک کی اطاعت کرنا ایک فطری عمل ہے کیونکہ وہ خلقی طور پر اس کے پابند ہیں لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار وارادہ سے بھی نوازا ہے۔ حیوانات اور انسان میں یہی فرق ہے کہ جانوروں کو اپنی حیوانی خواہشات کی تکمیل کے سوا کسی بات سے سروکار نہیں لیکن انسان کے اختیار

میں ہے کہ وہ اپنی خواہشات پر قابو رکھے اور مولا سے جو چاہتا ہے اسی کی بات رکھے۔ گویا اس میں یہ صلاحیت ودیعت کر دی گئی ہے کہ ہوا و ہوس کا بندہ یعنی عبدالھوی بن جائے یا خدا کا بندہ یعنی عبداللہ بن جائے۔

دنیا میں کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو اول الذکر راستہ اختیار کرتے ہیں۔ نفسانی خواہشات اور حرص و ہوا کے تابع ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دوسرا گروہ خداوند قدوس کی اطاعت کو اپنا شعار بناتا ہے۔

انسانوں میں اکثریت نفس امارہ کے حامل لوگوں کی ہے۔

تاریخ کے ہر دور میں انسانوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل رہی ہے جو نفس پرستی پر عمل پیرا رہے ہیں اور ان کے گلے میں شیطان کی بندگی کا طوق ہوتا ہے اور ان کا نصب العین اور مقصد حیات شہوات و لذات کی تسکین کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ نفس امارہ کے حامل ہوتے ہیں۔ دولت کی حرص اور امارت و ثروت کی خواہش ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ نیز کسی عورت پر نظر پڑ جائے تو ان کی نفسانی خواہش اور جذبہ شہوت جاگ اٹھتا ہے اور کہیں دولت ہاتھ آنے کی اطلاع پاتے ہیں تو اسی کے پیچھے بھاگنے لگتے ہیں ان کو حلال و حرام کی تمیز نہیں ہوتی ہے بلکہ کوئی ان سے حلال و حرام کا تذکرہ چھیڑ دے تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں طاغوت و سرکشی اسی کا نام ہے۔

نیکی کیا ہوئی تماشا ہوا۔

نفس امارہ کا تعلق کافروں کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بہت سارے مسلمان بھی اس کے حامل ہوتے ہیں جو عبادت کرتے ہیں تو ریاکاری سے کام

لیتے ہیں۔ یا شہرت کے طالب ہوتے ہیں یا اپنی کسی حاجت روائی کی خاطر عبادت کا سہارا لیتے ہیں حتیٰ کہ سفراور تجارتی اغراض کا بھی عبادت نام رکھتے ہیں چنانچہ ان کے حج سے مقصود یہی ہوتا ہے۔ پس جو عبادت اس نیت سے کی جائے وہ نفس امارہ کی عبادت ہوتی ہے۔ جس میں نفس کی حکمرانی ہی کا دخل ہوتا ہے۔ جب کوئی نیک کام انجام دیتا ہے تو اس کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے درحقیقت یہ کوئی نیکی نہیں بلکہ اس میں بدی ہی کا پہلو شامل ہوتا ہے کیونکہ اس کے کرنے میں نیت تو نیک نہ تھی محض اپنے نفس کی تسکین کے لئے یہ نیک کام کیا تھا۔

جب کوئی طبعاً بد ہو تو بدی ہی کی طرف مائل رہتا ہے۔

جب نفس امارہ کا مستقل غلبہ ہو تو نیکی بھی بدی میں بدل جاتی ہے۔ ہائے افسوس کہ آدمی نیک کاموں کو بھی بدنیتی سے انجام دیکر اس کے اجرو ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی طاغوتی عمل اس کو سیدھا جہنم میں لے جائے گا۔

"فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۙ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۙ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۭ

(سورہ النازعات۔ آیات ۳۷۔۳۹)

کیونکہ اپنے نفس سے مغلوب ہو جانے اور ظلم و زیادتی کا رویہ اپنانے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ نفس کے دوسرے درجہ یعنی نفس لوامہ کا حال بیان کروں تاکہ پہلے درجہ یعنی نفس امارہ کی حقیقت اور واضح ہو جائے۔

گناہ کے بعد نفس برائی سے بے زار ہو جائے تو وہی نفس لوامہ ہے۔

نفس کا دوسرا درجہ وہ ہے جو نفس لوامہ کہلاتا ہے اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بھی اس کی قسم کھائی ہے۔

وَلَآ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ

(سورہ القیٰمۃ۔ آیت ۲)

انسان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے نفس ہی کے حکم کا تابع رہتا ہے اور جب تک اس کی اطاعت کرتا رہے گا تب تک اپنے آپ کو برائیوں میں مبتلا پائے گا۔ کیونکہ نفس امارہ گناہ پر بھی اکساتا ہے اور ڈھٹائی سے بھی کام لیتے ہوئے اس پر نادم بھی نہیں ہوتا ہے کیونکہ اس کے دل میں کوئی خوف خدا نہیں ہوتا۔ گناہ کے ارتکاب کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت بھی نہیں ہوتی۔ حالانکہ چاہے تو خدا کی بندگی بھی اختیار کرلے اور ارتکاب گناہ کے پہلے مرحلہ ہی میں اپنے آپ سے بیزاری اور اپنے نفس پر ملامت کرنے لگے کہ مجھ سے فلاں گناہ کیوں سرزد ہوا یا میں نے فلاں فرض یا واجب کیوں ترک کردیا۔

اس طرح کا عمل ایمان ہی کا مظہر ہے۔

کافر و مومن کی پہچان کے لئے جو مثال بیان کی جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر سے گناہ سرزد ہو جائے تو ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کی ناک پر مچھر یا مکھی بیٹھ جائے اور اڑ جائے جس کی اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی ہے گویا کہ کوئی

بات ہی نہیں ہوئی۔

لیکن مومن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ گناہ کا ارتکاب اس کے لئے ایسا ہے گویا وہ کسی وادی سے گزر رہا تھا اور ناگہاں پہاڑی سے کوئی زبردست چٹان اس کے اوپر آگری ہو۔ نیز مومن اگر دن میں کوئی گناہ کر بیٹھے تو رات بھر گڑ گڑاتا رہے گا گویا اس نے اپنی ماں کو سخت سست کہدیا ہو اور اس کی شان میں گستاخی کر بیٹھا ہو۔ غرض کہ اس میں ایمان کی رمق باقی ہے اور چونکہ وہ مومن ہے لہذا اپنے آپ کو ملامت کرتا رہے گا۔

نفس مطمئنہ سے گناہ سرزد نہیں ہوتا

ایک روایت کی رو سے حضرت امام محمد باقر نے ایمان اور بے ایمانی کا فرق اس طرح واضح کیا ہے۔ مومن کی یہ نشانی نہیں کہ اس سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوتا ہاں اگر نفس مطمئنہ کے درجہ تک اس کی رسائی ہو جائے تو پھر کسی گناہ کا سرزد ہونا اسکے لئے انتہائی رنج اور بے چینی کا باعث ہوتا ہے۔ اس کے برعکس نفس امارہ ہے جو بے باکی سے گناہ کا ارتکاب کئے چلا جاتا ہے اور اس پر بضد قائم بھی رہتا ہے۔ یہ اسلئے کہ اس کے دل میں ایمان نہیں ہوتا۔

نفس امارہ کا آخری ٹھکانا تو جہنم ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کفر و عصیان پر جو لوگ ڈٹے رہتے ہیں ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے کیونکہ احکام خداوندی کی سرتابی کرتے وقت انہیں کوئی خوف نہیں ہوتا۔ اگر زندگی خوش حالی اور عیش و تنعم میں گزرتی ہے تو بزعم خود یہ کہتے ہیں کہ یہ مال و دولت اور جاہ و ثروت ان کی عقلمندی چالاکی اور ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اور کہیں وہ ان نعمتوں کو کھو بیٹھتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں کہ ان پر ظلم ہو گیا اور سارے عالم سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جیسے سب انکے دشمن

ہو گئے ہوں۔

نفس لوامہ خضوع و خشوع اور صبر سے کام لیتا ہے

نفس لوامہ کی حالت بالکل مختلف ہے وہ خضوع و خشوع سے کام لیتا اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتا ہے اور کوئی نعمت مل جائے تو شکر بجالاتا ہے کہ یہ مولا کا کرم ہے حالانکہ وہ اس کا مستحق بھی نہ تھا۔

آلام و مصائب کے وقت نفس لوامہ بڑے صبر و تحمل کا ثبوت دیتا ہے اور قضا و قدر کے فیصلوں پر اعتراض یا اظہار ناراضگی نہیں کرتا کہ ہر کام میں قدرت و مشیت الہیٰ کا دخل ہے۔

لیکن یہ باتیں کتابوں سے یا درسگاہ اور مکتب میں سیکھنے کی نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی عام آدمی کو جو ان پڑھ ہو اپنی عنایت و رحمت سے اس درجہ پر فائز کر دے اور ایک عالم یا پڑھے لکھے آدمی کی قسمت میں نہ ہو اور وہ اس رتبہ سے محروم رہ جائے۔

مستطرف میں ایک حکایت میری نظر سے گزری جس کو یہاں بیان کرتا ہوں۔

ایک صحرا نشین بڑھیا کا اپنے بیٹے کی وفات پر صبر و تحمل کا مظاہرہ

حج بیت اللہ پر جانے والے ایک قافلہ کی یہ حکایت بڑی عبرتناک ہے۔ پہلے زمانہ میں حجاز کا سفر خاصا دشوار گزار ہوا کرتا تھا۔ لوگ چلچلاتی دھوپ میں اونٹوں کی پیٹھ پر سفر کرنے پر مجبور تھے۔ قافلہ کا ایک شخص بیان کرتا ہے کہ انہوں نے اثنائے راہ میں ایک خیمہ دیکھا جس میں ایک بڑھیا تن تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ قافلہ والوں نے اس سے کچھ کھانے کے لئے مانگا اس نے کہا

کہ آپ لوگ آرام سے بیٹھ جائیں۔ میرے اونٹ اور بکریوں کو میرا لڑکا اور میرا نوکر چرانے اور پانی پلانے کے لئے لے گئے ہیں۔ جونہی وہ لوٹ کر آئینگے میں آپ لوگوں کی خاطر تواضع کر سکوں گی۔

حاجیوں کے قافلہ کیلئے خیمہ میں فرش بچھا کے وہ باہر نکلی تو دور سے اونٹوں کا گلہ اور بکریوں کا ریوڑ آتا دکھائی دیا لیکن دیکھا کہ ایک شتربان آہ و بکا کر رہا ہے۔ بڑھیا نے اس کے قریب جاکر دریافت کیا کہ کیا ماجرا ہے۔ شتربان نے رو رو کر اس سے بیان کیا کہ ہم لوگ اونٹوں کو پانی پلا رہے تھے وہاں اور بھی اونٹوں کا جمگھٹا ہو گیا تھا۔ وہ سب پانی پر ٹوٹ پڑ رہے تھے۔ ان کی ریل پیل میں آپ کا بچہ ناگہانی کنوئیں کے اندر گر پڑا۔ اس زمانہ کے کوئیں بھی بڑے گہرے ہوا کرتے تھے اور ایک دفعہ کوئی ان میں گر جائے تو باہر آنا ممکن نہ تھا۔ بڑھیا نے بڑے تحمل کے ساتھ یہ المناک داستان سنی اور بڑے اطمینان کے ساتھ نوکر سے کہا کہ میرے ہاں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں وہ کہیں ناراض نہ ہو جائیں تم جلدی سے ایک بکری ذبح کر کے ان کے لئے پیش کر دو۔

قافلہ میں سے ایک شخص کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے بڑھیا سے کہا کہ ہمیں سخت افسوس ہے کہ آپ کے ساتھ یہ سانحہ پیش آیا ہے آپ اب ہماری مہمان نوازی کا خیال چھوڑ دیں۔ اس عورت نے بڑی ہمت سے یہ جواب دیا کہ مجھے تو اس سانحہ کا کوئی ملال نہ تھا آپ لوگوں نے اس طرف توجہ دلائی اور افسوس کا اظہار کر رہے ہیں حالانکہ اگر سوچو تو میرا کام صبر کرنا ہے جسکی قرآن مجید میں تلقین کی گئی ہے۔ آپ لوگوں میں سے کوئی قرآن مجید کی تلاوت کر سکتا ہے تو مہربانی کر کے مجھے اس کا کچھ حصہ سنائیں۔ قافلہ کے ایک شخص نے قرآن مجید کے اس حصہ کی تلاوت شروع کر دی جس میں مصائب و آلام کے وقت

صبر کی تلقین کی گئی ہے اور صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مژدہ سنایا گیا ہے کہ وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ○ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ○ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ○

(سورہ البقرۃ آیات ۱۵۵۔ تا ۱۵۷)

اس بوڑھی خاتون نے اس قدر سننے کے بعد کہا کہ بس اتنا کافی ہے اسلئے کہ صبر کی جو تلقین کی گئی ہے اسی پر میں عمل پیرا ہوں۔ خدا اس کا اجر ضرور دے گا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور وضو کر کے اس نے دو رکعت نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر اللہ تعالیٰ کے حضور دعا مانگی کہ خداوندا اگر تیری مرضی ہوتی کہ اس عالم فانی میں کسی کو حیات ابدی سے نوازا جائے تو اسکے سب سے زیادہ سزاوار تیرے انبیاء اور مرسلین ہوتے۔ اے پروردگار تو نے قرآن حکیم میں ہمیں صبر کا حکم دیا ہے میں ایک ضعیف اور ناتواں عورت ہوں لیکن تیرے حکم کی تعمیل میں صبر کرتی ہوں۔ اے رب العزت صبر کرنے والوں کیلئے تو نے جس اجر کا وعدہ فرمایا ہے مجھے اس سے محروم نہ فرما۔

دعا کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور مہمانوں کی خاطر تواضع میں اسطرح منہمک ہو گئی جیسے کوئی المناک سانحہ واقع ہی نہ ہوا تھا۔

نفس امارہ کی بے صبری

اگر وہ بڑھیا نفس امارہ کی حامل ہوتی تو قضا و قدر کے فیصلہ پر یقیناً

بےحال ہو جاتی اور غم و غصہ کے عالم میں آہ وزاری کرنے لگتی کیونکہ نفس امارہ معمولی معمولی مصیبت کو بھی ناقابل برداشت خیال کرتا ہے لیکن جیسی افتاد اس بڑھیا پر آن پڑی تھی اس نے خدا کی طرف سے خیال کرکے سر تسلیم خم کر دیا۔

پس ہمیں چاہیئے کہ نفس امارہ کی حقیقت سے خوب واقف ہو جائیں ایسا نہ ہو کہ عمر بھر ہم یہی سمجھتے رہیں کہ ہمارا ایمان پختہ ہے درآنحالیکہ نفس امارہ کی گرفت سے نہ نکل سکے۔ اسلئے ہماری بھلائی اور فلاح اس میں ہے کہ اپنے آپ کا محاسبہ کرتے رہیں۔

البتہ نفس لوامہ سرکشی پر نہیں اکساتا گناہ سرزد ہو جائے تب بھی وہ اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے اور بے چین ہو جاتا ہے۔

نفس مطمئنہ کسی حال میں بھی اپنی عبودیت اور بندگی کے مقام کو فراموش نہیں کرتا

نفس کا تیسرا اور آخری درجہ جو بہت ہی شاذ و کمیاب ہے وہ نفس مطمئنہ کا ہے دائمی طور پر خانہ خدا کے گدا کی حیثیت سے زندگی گزارتا ہے نہ کہ کسی اور کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ دن کے ۲۴ گھنٹے مسجد ہی میں بسیرا کیئے رہتا ہو بلکہ اس کا دل اپنے رب سے بغاوت اور سرتابی کی طرف مائل ہی نہیں ہوتا۔ نیز اس کے ایمان میں نہ تو تزلزل ہوتا ہے اور نہ تذبذب کہ کبھی تو خدا پر ایمان ہو اور کبھی اپنے نفس کا بندہ بن جائے۔ اسے ہر حال میں اپنی عبودیت اور بندگی کے مقام کا احساس ہوتا ہے اگر اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں سے نوازے تب بھی وہ اپنے آپ کو بندہ ہی خیال کرتا ہے اور دولت اسکے ہاتھوں سے چھن جائے تب بھی وہ اسی کا بندہ رہتا ہے خواہ

کہ آپ لوگ آرام سے بیٹھ جائیں۔ میرے اونٹ اور بکریوں کو میرا لڑکا اور میرا نوکر چرانے اور پانی پلانے کے لئے لے گئے ہیں۔ جونہی وہ لوٹ کر آئینگے میں آپ لوگوں کی خاطر تواضع کر سکوں گی۔

حاجیوں کے قافلہ کیلئے خیمہ میں فرش بچھاکے وہ باہر نکلی تو دور سے اونٹوں کا گلہ اور بکریوں کا ریوڑ آتا دکھائی دیا لیکن دیکھا کہ ایک شتربان آہ و بکا کر رہا ہے۔ بڑھیا نے اس کے قریب جاکر دریافت کیا کہ کیا ماجرا ہے۔ شتربان نے رو رو کر اس سے بیان کیا کہ ہم لوگ اونٹوں کو پانی پلا رہے تھے وہاں اور بھی اونٹوں کا جمگھٹا ہو گیا تھا۔ وہ سب پانی پر ٹوٹ پڑ رہے تھے۔ ان کی ریل پیل میں آپ کا بچہ ناگہانی کنوئیں کے اندر گر پڑا۔ اس زمانہ کے کوئیں بھی بڑے گہرے ہوا کرتے تھے اور ایک دفعہ کوئی ان میں گر جائے تو باہر آنا ممکن نہ تھا۔ بڑھیا نے بڑے تحمل کے ساتھ یہ المناک داستان سنی اور بڑے اطمینان کے ساتھ نوکر سے کہا کہ میرے ہاں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں وہ کہیں ناراض نہ ہو جائیں تم جلدی سے ایک بکری ذبح کر کے ان کے لئے پیش کر دو۔

قافلہ میں سے ایک شخص کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے بڑھیا سے کہا کہ ہمیں سخت افسوس ہے کہ آپ کے ساتھ یہ سانحہ پیش آیا ہے آپ اب ہماری مہمان نوازی کا خیال چھوڑ دیں۔ اس عورت نے بڑی ہمت سے یہ جواب دیا کہ مجھے تو اس سانحہ کا کوئی ملال نہ تھا آپ لوگوں نے اس طرف توجہ دلائی اور افسوس کا اظہار کر رہے ہیں حالانکہ اگر سوچو تو میرا کام صبر کرنا ہے جسکی قرآن مجید میں تلقین کی گئی ہے۔ آپ لوگوں میں سے کوئی قرآن مجید کی تلاوت کر سکتا ہے تو مہربانی کر کے مجھے اس کا کچھ حصہ سنائیں۔ قافلہ کے ایک شخص نے قرآن مجید کے اس حصہ کی تلاوت شروع کر دی جس میں مصائب و آلام کے وقت

صبر کی تلقین کی گئی ہے اور صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مژدہ سنایا گیا ہے کہ وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ○ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ○ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ○

(سورہ البقرۃ آیات ۱۵۵ - تا ۱۵۷)

اس بوڑھی خاتون نے اس قدر سننے کے بعد کہا کہ بس اتنا کافی ہے اسلئے کہ صبر کی جو تلقین کی گئی ہے اسی پر میں عمل پیرا ہوں - خدا اس کا اجر ضرور دے گا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور وضو کرکے اس نے دو رکعت نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہوکر اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر اللہ تعالیٰ کے حضور دعا مانگی کہ خداوندا اگر تیری مرضی ہوتی کہ اس عالم فانی میں کسی کو حیات ابدی سے نوازا جائے تو اسکے سب سے زیادہ سزاوار تیرے انبیاء اور مرسلین ہوتے۔ اے پروردگار تونے قرآن حکیم میں ہمیں صبر کا حکم دیا ہے میں ایک ضعیف اور ناتواں عورت ہوں لیکن تیرے حکم کی تعمیل میں صبر کرتی ہوں - اے رب العزت صبر کرنے والوں کیلئے تو نے جس اجر کا وعدہ فرمایا ہے مجھے اس سے محروم نہ فرما۔

دعا کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور مہمانوں کی خاطر تواضع میں اسطرح منہمک ہوگئی جیسے کوئی المناک سانحہ واقع ہی نہ ہوا تھا۔

نفس امارہ کی بے صبری

اگر وہ بوڑھیا نفس امارہ کی حامل ہوتی تو قضا و قدر کے فیصلہ پر یقیناً

بحال ہو جاتی اور غم و غصہ کے عالم میں آہ و زاری کرنے لگتی کیونکہ نفس امارہ معمولی معمولی مصیبت کو بھی ناقابل برداشت خیال کرتا ہے لیکن جیسی افتاد اس بڑھیا پر آن پڑی تھی اس نے خدا کی طرف سے خیال کر کے سر تسلیم خم کر دیا۔

پس ہمیں چاہیئے کہ نفس امارہ کی حقیقت سے خوب واقف ہو جائیں ایسا نہ ہو کہ عمر بھر ہم یہی سمجھتے رہیں کہ ہمارا ایمان پختہ ہے درآنحالیکہ نفس امارہ کی گرفت سے نہ نکل سکے۔ اسلئے ہماری بھلائی اور فلاح اس میں ہے کہ اپنے آپ کا محاسبہ کرتے رہیں۔

البتہ نفس لوامہ سرکشی پر نہیں اکساتا گناہ سرزد ہو جائے تب بھی وہ اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے اور بے چین ہو جاتا ہے۔

نفس مطمئنہ کسی حال میں بھی اپنی عبودیت اور بندگی کے مقام کو فراموش نہیں کرتا

نفس کا تیسرا اور آخری درجہ جو بہت ہی شاذ و کمیاب ہے وہ نفس مطمئنہ کا ہے دائمی طور پر خانہ خدا کے گدا کی حیثیت سے زندگی گزارتا ہے نہ کہ کسی اور کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ دن کے ۲۴ گھنٹے مسجد ہی میں بسیرا کیئے رہتا ہو بلکہ اس کا دل اپنے رب سے بغاوت اور سرتابی کی طرف مائل ہی نہیں ہوتا۔ نیز اس کے ایمان میں نہ تزلزل ہوتا ہے اور نہ تذبذب کہ کبھی تو خدا پر ایمان ہو اور کبھی اپنے نفس کا بندہ بن جائے۔ اسے ہر حال میں اپنی عبودیت اور بندگی کے مقام کا احساس ہوتا ہے اگر اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں سے نوازے تب بھی وہ اپنے آپ کو بندہ ہی خیال کرتا ہے اور دولت اسکے ہاتھوں سے چھن جائے تب بھی وہ اسی کا بندہ رہتا ہے خواہ

شہوت اور نفسانی خواہشات کا کتنا ہی غلبہ ہوتا ہے اور اگر گناہ کی طرف اس کا میلان بھی ہو تب بھی وہ نہ تو بغاوت پر آمادہ ہوتا ہے اور نہ اس سے گناہ کا ارتکاب ہوتا ہے۔

ایسا شخص ان لوگوں میں شمار ہوگا جنھیں قرآن میں "سابقون" کا نام دیا گیا ہے۔

وَالسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ

(سورہ الواقعہ آیت ۱۰، ۱۱)

وہ نہ تو اصحاب الشمال میں سے ہوگا جن میں نفس امارہ کے لوگ شامل ہونگے اور نہ ہی اسے اصحاب یمین میں شامل کیا جائے گا جو نفس لوامہ کے حامل لوگوں کا گروہ ہوگا گویا نفس مطمئنہ کے حامل تو وہ لوگ ہونگے جنھیں قرآن میں "اولوالالباب" کہہ کر پکارا گیا ہے کہ وہ کھڑے بیٹھے اور لیٹے ہر حالت میں یاد خدا سے غافل نہیں ہوتے اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے بارے میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ

(سورہ آل عمران آیت ۱۹۱)

اپنے زیر پرورش یا ماتحت لوگوں پر برتری جتلانا

نفس مطمئنہ کا حامل اپنے آپ کو ہر حال میں بندہ ہی خیال کرتا ہے۔ اپنے بال بچوں کے لئے بھی روزی مہیا کرتا ہے تو ان پر کوئی احسان نہیں دھرتا اور خود کو ان کا روزی رساں نہیں سمجھتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نظام اور اسی مسبب الاسباب کا ذریعہ خیال کرتا ہے کیونکہ اہل و عیال کے لئے

روزی کمانے سے خود اسکے اپنے رزق کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔

آسائش اور عیش و عشرت کی زندگی میں بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور بغاوت پر آمادہ نہیں ہوتا اور تکلیف و مصیبت کے وقت قضائے الہیٰ پر خفگی و ناراضگی کا اظہار نہیں کرتا بلکہ اس مصیبت میں بھی اپنی عبودیت اور بندگی کو فراموش نہیں کرتا۔

اپنے فرائض دینی کے ادا کرنے اور بالخصوص اوقات نماز میں اول وقت نماز ادا کرتا ہے۔ اور اوامر الہیہ کی پابندی اور نواہی سے اجتناب پر سختی سے عمل کرتا ہے اور حرام کاموں سے باز رہتا ہے۔ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ خیر و شر سب مشیت الہیٰ کے تابع ہیں پھر تکلیف و راحت پر تنقید کا کیا اختیار ہے"

شہنشاہ حبشہ نجاشی کا خضوع و خشوع

جناب جعفر طیارؑ بھی ان مہاجرین میں شامل تھے جنہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایما پر حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی تاکہ کفار و مشرکین کے ظلم و ستم سے نجات مل سکے۔

انہوں نے نجاشی کو دیکھا کہ وہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس زمین کے فرش پر بیٹھا ہوا ہے۔ حضرت جعفرؑ اور ان کے ساتھی بھی اسکے قریب جا کر بیٹھ گئے اور خیریت دریافت کرنے کے بعد انہوں نے اس سے پوچھا کہ آج تو آپ کی وضع قطع ہی نرالی ہے۔ تخت شاہی کو چھوڑ کر آپ فرش خاک پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیا کوئی حادثہ پیش آگیا ہے؟

شہنشاہ نجاشی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ "ہمیں حضرت مسیحؑ کے بارے میں یہ روایت پہنچی ہے کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ تمہیں کسی نئی نعمت

سے نوازے تو اور زیادہ عجز وانکسار سے کام لو اور وہ نعمت جسکی بشارت حضرت مسیح نے دی تھی وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بارے میں تھی کہ اللہ تعالی انہیں مشرکین وکفار پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ اس نعمت سے سرفراز ہونے پر چاہتا ہوں کہ اسکی بارگاہ میں عجز وانکسار کے ساتھ شکر ادا کروں۔

نفس مطمئنہ کے حامل جو کچھ مانگتے ہیں خدا ہی سے مانگتے ہیں

نفس مطمئنہ کے حامل افراد خوش حالی اور عیش و عشرت کے زمانہ میں بھی احکام خداوندی سے سرتابی کا خیال دل میں نہیں لاتے وہ بعض جاہل لوگوں کی طرح نہ تو اپنے آپ کو اس کا مستحق گردانتے ہیں اور نہ یہ کہتے ہیں کہ میری نیت صاف تھی۔ میں خود نیک ہوں۔ میرا باطن پاک ہے اسی لئے اللہ تعالی نے مجھ پر کرم کیا اور اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ چونکہ میرے کام پسندیدہ تھے اس لئے خدا نے بھی اس کا اجر دیا ہے۔ اسکے برعکس جسکا نفس مطمئن ہو وہ آلام ومصائب میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ بلکہ اس کے خشوع و خضوع میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ ہر حال میں اپنے آپ کو بندہ ہی خیال کرتا ہے۔

دلی مسرت اور روحانی جنت

غرضیکہ نفس مطمئنہ اپنے مقام عبودیت پر خوش رہتا ہے نیز دن کے چوبیس گھنٹوں میں کبھی بھی بندگی کے راستہ سے بال بھرا انحراف نہیں کرتا۔ چاہے احکام شرعی ہوں یا تکوینی امور ان سب کو اللہ تعالی کی مصلحتوں میں شمار

کرتا ہے۔ خوشی ہو یا غم، راحت ہو کہ تکلیف ایک حال پر قائم رہتا ہے۔ جب نفس مطمئن ہو جائے تو گویا وہ خدا سے راضی ہو گیا اور سچ یہ ہے کہ یہی روحانی جنت ہے کیونکہ اس کا دل مسرت سے مالامال ہوتا ہے۔ مصیبتوں میں بھی اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیتا ہے اور نفس امارہ کو غلبہ پانے نہیں دیتا اور مرضی خداوندی کے آگے چون وچرا سے کام نہیں لیتا۔ نفس امارہ کی گرفت ڈھیلی پڑجاتی ہے جسکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چنین وچنان اور چون وچرا کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ یعنی ہر بات جو اسکی مرضی کے خلاف ہو وہ اس پر دل گرفتہ ہوتا ہے اور حزن وملال کا اظہار کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اتنی گرمی کیوں ہے۔ بارش کیوں نہیں ہوئی یا بارش کیوں ہوئی؟ یہ ساری باتیں نفس امارہ ہی سجھاتا ہے۔ اور نفس مطمئنہ کی سب سے بڑی سعادت رضائے الٰہی اور خوشنودی خداوندی کا حصول ہے چنانچہ وہ جس حال میں بھی رکھے اس پر راضی رہتا ہے۔

نفس مطمئن ہو تو ملک الموت بھی روح قبض کرتے وقت یہی آیہ شریفہ پڑھتا ہے

جب وہ خدا سے راضی ہو تو خدا بھی اس سے راضی رہتا ہے اور اسکے پسندیدہ اور محبوب بندوں میں اسکا شمار ہوتا ہے۔ اور موت کے وقت یہی آیہ شریفہ کانوں میں پڑتی ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں: جب ملک الموت کسی مومن (مومن یعنی جو نفس مطمئنہ کا حامل اور راضی برضا ہو) کی روح قبض کرنے آتا ہے تو اسکی ہمت بندھاتا ہے تاکہ اسکی موت کی وحشت دور ہو۔ پھر وہ اسطرح مخاطب ہوتا ہے کہ میں تجھ پر

تیرے باپ کی خاطر مہربانی کر رہا ہوں - پریشان نہ ہو ذرا اپنی نظریں تو اوپر اٹھا اور سر کے اوپر دیکھ (ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ ملکوتی اور برزخی آنکھوں سے یا اسطرح دیکھ جسطرح خواب میں دیکھا کرتا ہے) حالانکہ خواب میں مادی آنکھوں سے دیکھے بغیر بھی ہر ایک سے کہتا ہے کہ میں نے فلاں خواب دیکھا) غرضکہ مومن جب اوپر کی طرف نگاہ کرتا ہے تو اسے اہل بیت اطہار کے پاک اور پرانوار چہرے دکھائی دیتے ہیں - ان پر نگاہ پڑتے ہی اسکے کانوں میں یہ صدا گونجتی ہے (جسے وہ پورے ہوش و حواس سے سنتا ہے کیونکہ ابھی اس کی روح پرواز نہیں کرتی)

" يَا اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِىْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً "

ہمارے خاص بندوں میں داخل ہو جا

اس سے کہا جاتا ہے کہ اے نفس مطمئن رب العالمین کا خوان نعمت تیرے لئے بچھا دیا گیا ہے - اے ہمارے ثابت قدم بندے تو نے حسینؑ کی طرح عبداللہ بن کر زندگی گزاری ہے پس ہمارے عباد میں شامل ہو جا - تو ان لوگوں میں سے ہے جو نفوس مطمئنہ کے حامل ہیں پس اپنے جن آقاؤں کو تو اپنے سرھانے دیکھ رہا ہے میرے وہ بندے ہیں جو رضا و تسلیم کے پیکر ہیں پس اب یہ ثابت ہو گیا کہ اس آیہ شریفہ کے اصل مصداق حسینؑ ہی ہیں - یہاں بہت سی باتیں اشاروں میں بتا دی گئی ہیں جو بیان نہیں کی جا سکتیں - چنانچہ یہ بھی روایت ہے کہ مومن کی روح اس بات کی آرزو مند رہتی ہے کہ اسے جلد سے جلد اپنے محبوبوں کا دیدار اور وصال میسر آجائے -

مومن کی موت بھی خوشی خوشی واقع ہوتی ہے

امام جعفر صادقؑ کی اسی روایت کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ایک شخص نے امامؑ موصوف سے دریافت کیا کہ آیا مومن تکلیف سے مرتا ہے یا مرتے وقت خوش رہتا ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا مومن کی موت بھی خوشی کے عالم میں واقع ہوتی ہے اور اسکی مزید تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

چونکہ رنج والم کے بغیر راحت کا تصور نہیں ہوسکتا اسلئے مومن کو ہمیشہ اس بات کے لئے کوشاں رہنا چاہیئے کہ عباداللہ میں اسکا شمار ہو تاکہ اللہ کے نیک بندوں کو ملنے والی نعمتوں سے بہرہ مند ہوسکے۔

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا

(سورہ الدھر آیت ۶)

جنت کے چشموں اور حوض کوثر کے تو اہل بیتؑ پنجتن ہی وارث ہونگے اور ان سے سیراب ہونے والے صرف ابرار اور نیکوکار بندے ہونگے۔

اہل بیت تو مطلقاً عباداللہ ہیں اور سورہ دھر میں جن ابرار و نیکوکار بندوں کا ذکر آیا ہے وہ شیعوں ہی کے ابرار و نیکوکاروں کا ہے۔

لوامگی پر مسلسل قائم رہنے والے نفس مطمئنہ کا حصول آسان ہوجاتا ہے

پس اے مومنو آؤ کہ نفس امارہ سے چھٹکارا پانے کے لئے مسلسل جدوجہد اور سعی کریں اسطرح اگر نفس مطمئنہ تک نہ پہنچ سکیں تو کم از کم نفس لوامہ تک رسائی ہوجائے۔ چاہیئے کہ سحر خیزی کو اپنی عادت بنالیں اللہ

تعالیٰ سے عفو و درگزر کے خواستگار ہوں اپنے گناہوں پر شرمسار ہوں خدا کے حضور ندامت کا اظہار کریں۔ یہ کیفیت نفس لوامہ کی ہوگی اور اس پر مسلسل قائم رہنے سے اصلاح حال کی امید ہو سکتی ہے۔ جو بالآخر نفس مطمئنہ ہی میں مضمر ہے۔ اس دار فانی اور عاقبت کی ہر خوشی اور کامیابی کا راز رضا و تسلیم کے مقام تک رسائی حاصل کرنے میں پنہاں ہے۔

حقیقی معنوں میں توبہ و استغفار ہی ذریعہ نجات ہے

کہو۔

"اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ"

آؤ کہ اپنی پچھلی توبہ کو بھی درست کر لیں کیونکہ یہ کہنا کہ میں نے تورات کچھ توبہ کر لی تھی فائدہ مند ہوگا۔ اگر تم نے توبہ کو بھلا دیا تو گناہ سے کس طرح بچ سکو گے۔ توبہ کا اثر تو یہ ہونا چاہیئے کہ پھر تم سے گناہ سرزد ہی نہ ہو۔

حقیقی توبہ وہی ہے جو تمہارے تزکیۂ نفس کے کام آئے اور تمہارے حال کی اصلاح کرے امام زین العابدینؑ ہر وقت یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ اے خداوندا مجھے اپنی توبہ پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرما تاکہ میرا نفس پاک ہو جائے اور تیری محبوبیت کے مقام کا اہل بن جاؤں۔

توبہ کے سلسلہ میں ایک اور نکتہ ذہن نشین کر لو۔ مومن کو چاہیئے کہ خوف و رجا اور امید و بیم کے عالم میں اپنا وقت گزارے۔ توبہ کرے تو اپنی توبہ پر خوش نہ ہو اور مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائے۔ چاہیئے کہ ایک گناہ پر بھی ساری عمر خجالت اور پشیمانی کا اظہار کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ کی بخشش کا

امیدوار رہے۔ لہذا ہر وقت توبہ کرتا رہے اور مطمئن ہو کر یہ نہ سمجھ لے کہ گناہ معاف ہو گئے کیونکہ یہ تو غرور اور تکبر کی علامت ہے۔ خدا چاہے تو معاف کرے اور نہ چاہے تو سزا دے بندہ کا کام تو مغفرت کا طالب ہونا ہے۔ ہم یہاں صحیفۂ سجادیہ میں منقول دعائے توبہ نقل کر رہے ہیں جو امام زین العابدین کا مخصوص وظیفہ تھا۔

أَسْتَغْفِرُكَ مِنْ كَبَائِرِ ذُنُوْبِيْ وَ صَغَائِرِهَا وَحَوَادِثِ زَلَّاتِيْ وَ سَوَابِقِهَا أَسْتَغْفِرُكَ مِنْ كُلِّ مَا خَالَفَ إِرَادَتَكَ أَوْ أَزَالَ مَحَبَّتَكَ مِنْ لَحَظَاتِ عَيْنِيْ وَخَطَرَاتِ قَلْبِيْ وَحِكَايَاتِ لِسَانِيْ وَحَرَكَاتِ جَوَارِحِيْ

توبہ و استغفار کے وقت چاہیئے کہ اپنے گناہوں اور خطاؤں کو یاد کرے اپنے آپ پر ملامت کرے۔ اور غور کرے کہ تو نے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں کس کس نعمت کا شکر ادا کیا ہے کیونکہ ہم لوگ تو کفران نعمت ہی کرتے رہتے ہیں۔ اور اسکا شکر ادا کرنے سے باز رہتے ہیں۔